سلطانہ

رئیس احمد جعفری

کتاب منزل

کشمیری بازار ——— بندر روڈ
لاہور • کراچی

فہرست

۱۔ سنہرے خواب ۹
۲۔ وہ دن خوشی کے ۱۳
۳۔ ناگہانی حملہ ۱۶
۴۔ باندی ۳۱
۵۔ میری وفادار ایرانی کنیز ۳۵
۶۔ بازار غلاماں ۴۴
۷۔ میری قیمت سو اشرفی ۴۸
۸۔ قصر یلدیز ۵۲
۹۔ آرائش ۵۴
۱۰۔ میرا رکھ رکھاؤ ۵۸
۱۱۔ والدۂ سلطان کے سامنے ۶۳
۱۲۔ میری پیاری عزیزی ۶۸
۱۳۔ والدۂ سلطان ۷۳
۱۴۔ خوانِ نعمت ۷۷
۱۵۔ لولا ۷۹
۱۶۔ باسفورس کی سیر ۸۹
۱۷۔ قسمت پر پتھروں کا اثر ۹۵
۱۸۔ بادشاہ ایک باندیاں بہت سی ۱۰۱
۱۹۔ دنیا کی ہر راحت میسر تھی مگر ۱۰۴
۲۰۔ جہاں عورتیں بکتی ہیں ۱۰۸
۲۱۔ رقاصہ کا کمال ۱۱۳
۲۲۔ قسمت ۱۱۹
۲۳۔ محلسرا کی زندگی ۱۲۲
۲۴۔ ایک پاشا کی محلسرا ۱۲۸
۲۵۔ قفس زریں ۱۳۵
۲۶۔ محبت کا راز ۱۴۱
۲۷۔ وہ بردہ فروش ۱۴۹
۲۸۔ عزیزی سمندر میں ڈوب گئی ۱۵۴
۲۹۔ شاہ خرچیاں ۱۶۳
۳۰۔ سلطان کا خاص کمرہ ۱۶۵

سلطانہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں
سلسلہ مطبوعات نمبر ۲۳۷

طبع اوّل .... اگست ۱۹۵۹ء
قیمت .... پانچ روپے

تعداد .... دو ہزار

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر
کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

نشاط خانم جارجیا (روس) کے ایک مسلمان قبیلہ کے سردار کی لڑکی تھی
خوبصورت، سمن بر، پری پیکر، اس کے جمال و رعنائی کو آسمان کے تارے جھک جھک
کر دیکھتے تھے، اس کی برنائی و زیبائی کے سامنے چاند ماند تھا، وہ شہسوار تھی، تادر انداز تھی، وہ
وادیوں کی سیر کرتی، کوہستانی علاقوں میں پُرنے گل کی طرح عنبر افشانی کرتی،

لیکن ایک روز

اس کی شاندار حویلی پر قزاقوں نے حملہ کیا، وفادار اور جان نثار خادماؤں اور
غلاموں نے خون کے آخری قطرہ تک حق وفا نبھایا، خود نشاط خانم آخر وقت تک، بندوق
اور پستول چلاتی رہی، آخر وہ گرفتار کر لی گئی،
گرفتار ہو کر غلاموں کے بازار میں پہنچی، نیلام ہوا، اور قطعہ اشرفی میں وہ خرید
لی گئی،
قسطنطنیہ لے جائی گئی، جو خلافت عثمانیہ اور حکومت ترکیہ کا پایہ تخت تھا،
یہاں وہ حرم سرا میں باندی کی حیثیت سے داخل ہوئی اور ایک روز سلطان والا شان
کی منظور نظر بن کر نہ صرف حرم سرا کی ملکہ سارے ملک کی فرماں روا بن گئی —
قسمت کا کھیل!

سلطان ترکی اور اس کی حرم سرا کے بارے میں افواہوں، سازشوں، اور جھوٹ پر مبنی بہت سی داستانیں انگریزوں نے لکھی ہیں، جن کا ایک حرف بھی سچ نہیں،

نشاط خانم نے اپنی سرگذشت حیات MY HAREM · LIFE کے نام سے لکھی ہے جو دلچسپ بھی ہے، سبق آموز بھی، اور عبرت انگیز بھی،

یہ ناول بھی ہے اور تاریخ بھی،

ناول سے زیادہ دلچسپ اور تاریخ کی طرح مستند ۔

اس میں محلات کی سازشیں، حرم سرا کی زندگی، ترکوں میں آزادی اور استقلال کی تحریک، سلطان کی معزولی، نئی حکومت کے قیام اور نئی ترک عورت کی کہانی نشاط خانم نے لکھ کر قلم توڑ دیا ہے ۔

کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چین نہیں آسکتا ۔

۳۱- رمضان اور عید کی چہل پہل ۱۶۹
۳۲- دربار عید ۱۷۳
۳۳- وزیر اعظم کی کہانی ۱۷۵
۳۴- عذرا ۱۸۰
۳۵- فوج کی سلامی ۱۸۶
۳۶- درویش ۱۸۹
۳۷- میری ترقی میرا عروج ۱۹۱
۳۸- شطرنج ۱۹۵
۳۹- میں نجومی بن گئی ۲۰۱
۴۰- قتل کے بعد تغیرات ۲۰۶
۴۱- منزل قریب آگئی ۲۱۲
۴۲- زہر ۲۲۰
۴۳- سلطان مراد کا تحفہ ۲۲۷
۴۴- کینہ ہی کینہ ۲۲۹
۴۵- ضمیر کی خلش ۲۳۱
۴۶- دارا غرق کر دی گئی ۲۳۶
۴۷- عقوبت گاہ ۲۴۰
۴۸- زہر دے دو ۲۴۲
۴۹- مصنوعی بچہ ۲۴۹
۵۰- میرا حمل ۲۵۳
۵۱- قسمت کا کھیل ۲۵۶
۵۲- کیا اوج پر ستارہ گوہر فروش ہے ۲۶۲
۵۳- میں سلطان کی منظور نظر بن گئی ۲۶۹
۵۴- چیلنج ۲۷۵
۵۵- جشن مسرت ۲۷۹
۵۶- جب سورج گو رفتہ مغرب میں جا چھپا ہے ۲۸۴
۵۷- میں اور میرا بادشاہ ۲۸۶
۵۸- رحم دل ترک ۲۹۴
۵۹- بغاوت کی تیاریاں ۲۹۶
۶۰- آنسو ۳۰۶

(ا)

سنہرے خواب

ٹھٹھرا دینے والی ہوائیں ہماری گھاٹی میں جاڑے بھر چلتی رہیں، اب فصلِ بہار کی آمد آمد تھی اور وہ جھکڑ ختم ہو چکے تھے جنہوں نے ہمارے جارجیا کے سارے علاقے میں آفت مچا رکھی تھی۔ میں اپنی والدہ کے مکان میں ایک برآمدہ کے اندر کھڑی ہوئی دور بہت دور وادی کے سرے پر برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیاں ایک عجیب محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی، دل میں خوشی کی لہریں اٹھ رہی تھیں، امنگوں اور آرزوؤں کی دنیا میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

موسم بہار اپنی پوری رعنائیوں اور فتنہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا، موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی اس خیال سے دل میں چبھن ہونے لگتی تھی کہ جیسے ہی انگوروں کی فصل ختم ہوئی میری بڑی بہن کی شادی ہو جائے گی۔ میں اس شاندار اور وسیع و عریض مکان میں تنہا رہ جاؤں گی۔ یا میری بیوہ ماں! جس کا دامن میرے لئے مسرتوں کا گہوارہ اور میرا وجود جس کے لئے مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔

میں سوچ رہی تھی، وہ وقت بھی جلد آنے والا ہے جب میرا بیاہ بھی ہو

جائے گا۔ پھر اس وقت میری یہ سرگشتۂ الم ماں کیا کرے گی؟ کون اس کا سہارا بنیگا
کون اس کا ہاتھ بٹائے گا؟ کون اس کا جی بہلائے گا؟ کون اس سے باتیں کرے
گا۔ کون اسے مشغول رکھے گا؟ کہ غم کی اور ماضی کی تلخ یادیں تک یہ نہ پہنچ سکے۔ پھر
سب سے بڑھ کر یہ کہ میری ماں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ ان کے معاملات کون سلجھائے
گا؟ ہماری خاندانی جائداد کی رکھوالی کون کرے گا؟ میرے والد اپنے قبیلے کے سردار تھے
وہ کافی جائداد و املاک چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے جس میں ایک شاندار میوہ
باغ اور ایک پرانا مکان بھی شامل تھا۔ باغ ایک چار دیواری کے اندر محصور تھا۔ مکان
پر کئی خوشنما برج اور مینارے بھی تھے۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ ہمارے انگور کے باغیچوں
اور جنگلی علاقوں کے جوز اور دوسرے درختوں کی فصل کا حساب کتاب ٹھیکے داروں اور
دوسرے متعلقہ لوگوں سے کون کیا کرے گا؟ میں تو اپنے سسرال چلی جاؤں گی!

یہ سوچتے سوچتے میری چشم تماشہ علاقے کے نظر فریب اور دلکشا ماحول اور زندگی
سے بھرپور چہل پہل کی طرف متوجہ ہوگئی۔ یہ ہمارے کسان تھے، مضبوط، قدآور، تنومند
اور جفاکش! یہ زمین کھودتے، بیج بوتے، فصل اگاتے اور اس کا پھل کاٹتے تھے۔
یہ سامنے ایک خوبصورت سا بچہ ایک بیل کی گردن پر شہسوار بنا ہوا جا رہا ہے۔ چہرے پر [illegible]
اور تمکنت، سر پر ایک خوشنما اسٹراخانی ٹوپی، ہر فکر سے آزاد، ہر غم سے بے پروا، ہر اندیشے [illegible]
سے خالی، خوش اور سرور اپنے گھر کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے۔ اور ان نقرئی پہاڑ کے دل
کے پہلو میں وہ چشمے بہہ رہے ہیں جہاں بہت سی عورتیں جو محنت اور جفاکشی میں کسی مرد [illegible]
کم نہیں، ریت کے سمندر سے سونے اور چاندی کے ذرّے چن رہی ہیں۔ یہ ان کی محنت
ہے، یہی ان کی روزی ہے یہی ان کا کام ہے۔ اور یہیں اس مقام کے نیچے جہاں میں کھڑی [illegible]
ہوں، ایک گھر کی دو بیویاں اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ تندور سے بغیر خمیر کے آٹے [illegible]
گرما گرم روٹیاں نکال رہی ہیں۔

میری چشمِ تماشہ اور آگے بڑھی اب وہ ان پہاڑوں کی طرف محوِ خرام تھی جہاں انگوروں کے درخت نشو و نما کے مراحل طے کر رہے تھے۔ پھر ان جنگلوں میں پہنچی جہاں ہرن اور بارہ سنگھے چوکڑیاں بھر رہے تھے۔

یکایک مجھ پر افسردگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں سوچنے لگی: وہ دن جلد آنے والا ہے جب یہ سب کچھ چھوڑ کر میں ایک نئے ماحول ایک نئی زندگی ایک نئے گھر کو اپنانے پر مجبور ہو جاؤں گی۔

دفعتہً میرے کانوں میں گھر کے اندر سے والدہ کی آواز آئی۔ وہ مجھے بلا رہی تھیں۔ ان کی آواز سن کر میں چونک پڑی اور اپنے ان افسردہ کن خیالات کی دنیا سے باہر نکل آئی۔ وہ مجھے ناشتہ کے لئے بلا رہی تھیں۔ جیسے ہی میں ان کے پاس پہنچی ایک تبسم کے ساتھ دودھ کا پیالہ انہوں نے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! یہ تیرے لئے بہت مفید ہے اس سے تیرا رنگ نکھرے گا، پھر تجھے دیکھ کر قصرِ شاہی کی سلطانہ اور ایوانِ شہریاری کی ملکہ شرمائیں گی۔ خدا نظرِ بد سے بچائے حسن و جمال میں تیرا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟"

"سلطانہ" ———— کتنا دلکش اور کتنا سحر طراز تھا یہ لفظ میرے لئے! جانے کیا بات تھی جب بھی یہ لفظ میرے کان میں پڑتا ایک عجیب خوشی سی محسوس ہونے لگتی۔

اب کہ میں زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکی ہوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری ماں کے یہ الفاظ پیغمبرانہ پیشگوئی کے حامل تھے۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا کچھ عرصہ بعد وہ پورا ہوا۔ میں واقعی سلطانہ بن گئی۔ وقت کے سب سے بڑے سلطان کی محبوبہ، دنیا کے بہت بڑے تاجدار کی زینتِ پہلو! ہم کوہستان کی رہنے والی عورتوں کے بارے میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی نظر دوربین ہوتی ہے، ان کی نگاہ مستقبل کے

پہلے سے چیرتی ہوئی پیش آنے والے واقعہ کو دیکھ لیتی ہے۔ میری ماں نے غیر شعوری طور پر ایک بات مجھ سے کہی تھی لیکن انیس (۱۹) سال کی ایک دوشیزہ (یعنی میں) اس پیشگوئی کے بہاؤ میں گم ہو کر رہ گئی۔ میں سوچتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے واقعی حالات نے پلٹا کھایا ہے اور میں سلطانہ بن گئی ہوں۔ خواب دیکھتی تو ایک قصرِ زرنگار میں تختِ شاہی پر سلطانہ کی حیثیت سے اپنے آپ کو متمکن پاتی۔ زندگی کے جو خاکے بھی میں بناتی، کبھی میں نے اپنی حیثیت ایک سلطانہ سے کم نہیں محسوس کی!

میں خیالات کے اسی گرداب میں پھنسی ہوئی تھی کہ میری ماں نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور میرے ذہنی اضطراب کو تاڑ لیا۔ شفقت و محبت کے بھرپور لہجہ میں انہوں نے کہا۔

"میری بچی تو کیا سوچ رہی ہے؟"

میں نے دل کی بات نہ بتائی۔ انہیں ٹال دیا۔ میں نے کہا: "بہت جلد آپا کی شادی ہو جائے گی۔ آپ تنہا رہ جائیں گی۔ میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جائے گا۔"

والدہ نے مجھے تسلی دی اور کہا۔

"نہیں! پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا اچھا ہے گا تو سب کام ٹھیک طرح سے چلتے رہیں گے۔"

میری والدہ نوجوانی کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ ابھی بڑھاپے نے ان کی دہلیز پہ قدم نہیں رکھا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

"لڑکی! تو ابھی بچہ ہے۔ تیری عمر کی لڑکیاں کھیلنے کھانے میں وقت صرف کرتی ہیں، تو یہ کہاں کی فکریں لے کر بیٹھ گئی؟"

والدہ کسی دوسرے کام میں مصروف ہو گئیں۔ میں خاموشی سے گھونٹ گھونٹ کر کے دودھ پینے لگی لیکن میرے خیالات اس گھر سے دور کہیں باہر۔ نہ جانے کہاں! مصروفِ خرام تھے

---

(۲)

وہ دِن خوشی کے

تھوڑی دیر کے بعد میری والدہ نے اپنی ایرانی کنیز کو جو میری طرح نوعمر تھی بلایا اور اس سے کہا :

"جاؤ وہ چیزیں لے آؤ جو نشاط کو اس کی بہن کی شادی کے موقع پر دی جائینگی"
میری بہن کی شادی کل ہی ہونے والی تھی پر ایک دن کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ اشتیاق و انتظار کی دوگونہ کیفیت نے مجھے بے قرار کر رکھا تھا، اتنے میں کنیز پیکٹ لے کر آئی۔ خیالات پریشاں میرے پاس سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بہن کی شادی کے موقع پر والدہ نے میرے لئے اتنا قیمتی جوڑا تیار کر رہا تھا جو واقعی کسی شہزادی کیلئے زیب دیتا تھا۔ عالم خیال میں کئی بار میں شہزادی بن چکی تھی، کل یہ لباس فاخرہ پہن کر واقعی میں ایسی ہی لگوں گی جیسے کوئی مہ جمال اور پری وش شہزادی !

میں نے جلدی سے وہ شاندار جوڑا اٹھایا اور بھاگی بھاگی اپنے کمرہ میں پہنچی، والدہ مجھے پکارتی ہی رہ گئیں۔ مگر ان کی بات سننے کا مجھے ہوش کہاں تھا !

میرے آرائشی کمرہ میں ایک قد آدم آئینہ دیوار میں نصب تھا۔ میں نے وہ

لباس پہنا اور آئینہ کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اور حیرت سے اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔

یہ لباس مجھ پر ایسا سج رہا تھا، میرا خیال تھا کہ میری بہن بھی جو ایک دلہن کی حیثیت سے شاندار لباس زیب جسم کئے ہو گی میرے سامنے ماند پڑ جائے گی۔

آئینہ کے سامنے جو شہزادی اس وقت کھڑی مسکرا رہی تھی اس کا لباس کتنا شاندار تھا! سُرخ ریشم کا غرارہ جو ٹخنوں کے پاس آکر گاؤ دُم سا ہو گیا تھا، سبز ساٹن کی لمبی قمیض جس کا گلا سونے کے تاروں سے کڑھا ہوا تھا۔ خوبصورت جھالردار پٹی جو کمر پر بندھی ہوئی تھی، سیاہ مخمل کی خوشنما ٹوپی سر پر جس کی موتی کی لڑیاں مختلف اطراف میں لٹک رہی تھیں۔ موتیوں سے کڑھا ہوا سینہ بند، سفید ریشم کا سربند جس کے نیچے سر کے کالے بال نہایت احتیاط سے کئی چوٹیوں میں گندھے ہوئے تھے۔

یہ میں تھی! —————— اپنے تخیل کی شہزادی! — مجھے اپنے لمبے لمبے بالوں پر ناز تھا۔ جو میرے گھٹنوں سے بھی نیچے تھے۔

اتنے میں والدہ میرے کمرے میں آئیں۔ اس لباس میں مجھے ملبوس دیکھ کر ششدر رہ گئیں۔ بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا: "ماشاءاللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سلطان والا شان کی حرم سرا سے کوئی شہزادی میرے گھر آگئی"۔

میں چپ چاپ والدہ کی یہ باتیں سنتی رہی۔ ان کا احترام مانع تھا، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ گو میں چاہتی تھی کہ شہزادی نظر آؤں، لیکن کسی سلطان والا شان کی حرم سرا میں رہنا پابندی کی زندگی بسر کرنا مجھے منظور نہ تھی۔ ہم کوہستان کی رہنے والی عورتیں جو آزادانہ چلنے پھرنے گھومنے اور سیر و تماشہ کرنے کی عادی تھیں، حرم سرا کی چاردیواری میں گڑیوں کی طرح رہنا کس طرح پسند کر سکتی تھیں؟ لیکن نہ جانے کیوں یکایک میرے دل میں خیال آیا کہیں والدہ کے یہ الفاظ آگے چل کر پیشین گوئی کی صورت تو نہیں اختیار کر لیں گے؟

میرے دماغ میں یہی باتیں گردش کر رہی تھیں کہ دیکھتی کیا ہوں، میری بہن جن کی کل شادی ہونے والی تھی مسکراتی، شرماتی اور لجاتی چلی آ رہی ہیں، ان کے آنے کے بعد کل کے انتظامات پر ہم لوگ غور کرنے لگے۔ ان انتظامات کی فکر مہینوں سے ہمیں پریشان کئے ہوئے تھی۔ یہ کوئی معمولی شادی نہ تھی، وسیع اور شاندار پیمانہ پر اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میری بہن کی شادی پڑوسی قبیلہ کے سردار کے بیٹے سے ہو رہی تھی۔ جو خاصا دولت مند تھا، ضروری تھا کہ دعوت اتنی شاندار اور انتظامات اتنے مکمل ہوں جو اس بڑی تقریب کے بالکل شایان شان ہوں۔ کیونکہ اس شادی کے ذریعہ دو بڑے اور دولت مند خاندان ایک ہو رہے تھے۔ ہمارے سامنے جارجیا کی وہ مشہور کہاوت تھی۔

"باپ مر جاتا ہے اور خاندان کا ناموس اس کے مرتے ہی اولاد کے ہاتھوں میں آ جاتا ہے۔"

جس کل کا اتنے دنوں سے انتظار تھا اور جس کے لئے اتنے انتظامات کئے جا رہے تھے آخر وہ آ گیا! —

ایسا محسوس ہوا جیسے آج کی رات بہت چھوٹی تھی اور سورج وقت سے پہلے طلوع ہو گیا تھا، میں نے اپنے کمرہ کی کھڑکی کھولی اور دیکھا کہ سامنے کی پہاڑیاں دھوپ کا غسل کر رہی تھیں۔ اور کہر کی باریک نقاب اس طرح اس پر پڑی ہوئی ہے جیسے آج کی دلہن کا رُخ روشن نقاب کے پردہ سے اپنی ضیا باریوں کا جلوہ دکھا رہا ہے گلہ بانوں کے سُریلے نغمے فضا میں گونج رہے تھے، ان کے کتے بھونک بھونک کر داد دے رہے تھے، میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا، اور اپنی بہن کے کمرہ میں پہنچ گئی۔ وہ ہمیشہ سے دیر تک سوتے رہنے کی عادی تھی، لیکن آج میرے پہنچنے سے پہلے جاگ چکی تھی۔

بے ساختہ میری باہیں بہن کی گردن میں حمائل ہو گئیں، میں نے اسے پیار کرتے ہوئے پوچھا! —

"آپا سچ کہنا، کیا تم ہمیشہ ہی ایسی ہی خوش رہو گی، جیسی آج تم نظر آ رہی ہو؟"

اب گھر کے احاطہ سے شور و غوغہ کی آوازیں آنے لگی تھیں، مہمانوں کے آنے جانے کا تانتا لگا ہوا تھا۔ خیر مقدم میں پٹاخے چھوڑے جا رہے تھے، دوست اور پڑوسی، عزیز اور رشتہ دار ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ اس مجمع میں دشمن بھی موجود تھے، لیکن آج کے دن دشمنی فراموش کر چکے تھے، قبیلہ کے ہر فرد کے لئے ضروری تھا کہ خوش خوش اس تقریب میں شرکت کرے، کھانے پینے، ناچے گائے اور مسرت کا اظہار کرے۔ چند گھنٹوں کے اندر ہمارا گھر مہمان کدہ بن گیا۔ کسان اور کاشتکار، عزیز اور رشتہ دار، غریب اور سرمایہ دار سبھی بڑھ چڑھ کر اس تقریب میں حصہ لے رہے تھے، دلہن کے لئے تحفوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ ریشم کے کپڑے، زربفت اور کمخواب کے ملبوس، زیورات، فر کے کوٹ، اعلےٰ درجہ کی شالیں، موتی جڑی ہوئی جوتیاں، ریشم، فر اور مخمل کی ٹوپیاں، گھوڑے، زین، نقرئی اور طلائی دستوں کے کوڑے، خانہ داری کی چیزیں، قالین، نقرئی پٹیوں سے سجے ہوئے گدّے، سنہرے تاروں سے سِلے ہوئے تکیے اور نہ جانے کیا الابلا!

کھڑکی سے نچلی طرف جھانکتے ہوئے لوگوں کا یہ جم غفیر ہم دیکھ رہے تھے: سیاہ، سبز، سفید اور مختلف رنگوں کی ٹوپیاں پہنے خوبصورت پیٹیاں لگے ہوئے کوٹ بدن پر ڈالے، اونی چادریں کندھے پر رکھے لوگ اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ بعض نوجوان پیٹی لگی ہوئی مخملی صدریاں پہنے تھے، جن کے سامنے کے نچلے حصہ پر طلائی کام بنا ہوا تھا۔ کمر میں پیش قبض لٹکائے اِدھر اُدھر گشت کر رہے

تھے۔ بہت سے مردوں کے سینے پر کارتوس کی پیٹیاں بھی نظر آ رہی تھیں، جنگ و پیکار کے لئے نہیں بلکہ رسم و رواج کی پابندی کی خاطر۔ تلواروں اور چاقوؤں کی بھی کافی تعداد موجود تھی۔ اسلئے کہ بغیر انہیں استعمال کئے ناچ کی محفل صحیح طور پر جم ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ لوگ آج بہت خوش تھے، قہقہے لگاتے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے۔ جاجیا کے رہنے والے شادی کے موقع پر غم فراموش کر دیتے ہیں، اور خوشی میں زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

مرد تو باہر تھے، عورتوں کی محفل گھر کے اندر جمی ہوئی تھی، عورتوں کا مجمع بھی تقریباً اتنا ہی بڑا تھا، جتنا مردوں کا! بڑی بوڑھی عورتیں اپنی شادی کی داستانیں پوری رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کر رہی تھیں۔ بیتے ہوئے دنوں کی باتیں جن کا گواہ اب خود ان کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ نوجوان لڑکیاں اپنے زیورات کی نمائش کر رہی تھیں ہر لڑکی دوسری لڑکی کے زیورات پر تنقید یا تحسین سے بھری ہوئی نظر ڈالتی! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ معاملہ پختہ ہو جانے کی صورت میں زیورات کا تبادلہ بھی باہمی رضامندی سے عمل میں آجاتا۔

ہمارے گھر کی طرف کے راستے لوگوں سے پٹے پڑے تھے، غریب اور نادار لوگ، خواہ وہ نزدیک کے رہنے والے ہوں یا دور کے، ایسے مواقع پر ضیافت میں حصہ لینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ جارجیا کے رہنے والے لوگ شادی کے موقع پر دل کھول کر کھلاتے پلاتے ہیں۔ شراب سے بھرے ہوئے مٹکے موجود رہتے ہیں۔ جس کا جتنا جی چاہے پیئے۔ کیک، پھل اور مٹھائی بھی بڑی فیاضی سے حاضرین میں تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ کیا مجال جو کوئی نظر انداز کر دیا جائے۔ اس لئے کہ ہمارے ملک کے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ جب دلہن سسرال جاتی ہے تو دور و نزدیک سے آنے والے ان مہمانوں کی اس طرح آؤ بھگت کی جانی چاہیئے جیسے

یہ کوئی اجنبی نہیں، آدمی کے روپ میں فرشتہ ہیں۔

نکاح کی تیاریاں جب مکمل ہو چکتی ہیں، اور قاضی کی آمد آمد کا شور ہوتا ہے تو نشاط و طرب کے ہنگامے اور زیادہ ہو جاتے ہیں۔ باجے اور تاشے بجنے لگتے ہیں۔ نغمہ سرائی شروع ہو جاتی ہے، بانسری کی سریلی آوازیں فضا میں گونجنے لگتی ہیں۔ لوگ بے تابانہ اٹھتے ہیں اور تلوار ہاتھ میں لے کر ناچنا شروع کر دیتے ہیں، دھوپ میں ان تلواروں کی چمک بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کسی شادی کا دن قبیلہ کے ہر شخص کے لئے یوم طرب ہوتا ہے، جو شخص گا سکتا ہے وہ گاتا ہے، جو ناچ سکتا ہے، وہ ناچتا ہے۔ صرف چند از کار رفتہ بوڑھے الگ ایک گوشہ میں بیٹھے نگاہ حسرت سے یہ منظر دیکھتے اور اپنے عہد جوانی کے واقعات یاد کرتے، ایک دوسرے سے گھل مل کر باتیں کرتے رہتے ہیں۔

بارات کی روانگی کے وقت بُری روحوں کو ہلاک کرنے کے لئے اور ان کے شر سے بچانے کے لئے یہ کیا جاتا ہے کہ جب دلہن اپنی گاڑی میں قدم رکھتی ہے تو عزیز اور رشتہ دار، فضا میں گولیاں چلاتے ہیں۔ پھر دلہن شوہر کے ساتھ روانہ ہو جاتی ہے۔

رسم شادی کے اختتام کے بعد نئے جوڑے کا خوشی کے نعروں اور درازیٔ عمر و صحت کی دعاؤں کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے، یہ دعا بھی دی جاتی ہے کہ بہت سے بچے ہوں اور فصل ہمیشہ اچھی رہے۔ اِدھر دولہا دلہن نظر آئے اُدھر شور مرحبا بلند ہُوا۔ پھر عزیز اور رشتہ دار گھوڑوں پر بیٹھ کر ایک جلوس کی صورت میں نکلتے ہیں۔ تمام مہمان ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ شراب، پھل، روٹی، مٹھائی، کیک اور دوسری چیزیں حاضرین کو اور رہروؤں کو خواہ ان سے شناسائی ہو یا نہ ہو، اور جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہوتی ہے بڑی فیاضی سے تقسیم کی جاتی ہیں۔ ہر شخص دولہا اور دلہن کو دعائیں

دیتا ہے۔ اور کچھ سکے ان پر نچھاور کرتا ہے۔

ہمارے گھر پر دعوت کا اہتمام بڑے وسیع اور شاندار پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ دستر خوان بچھایا گیا اور سب لوگ پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھ گئے۔ کھانا شروع ہو گیا۔ کوئی شخص ایسے موقع پر یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ کتنا کھانا کافی ہوگا، لیکن یہ اندازہ پہلے سے ہوتا ہے کہ آدمی بہت ہوں گے اور ہر شخص خوب ڈٹ کر کھائے گا۔ لہذا معقول پہلے سے دعوت کی تیاریاں شروع کر دی جاتیں، پوری پوری بھیڑیں تلی ہوئی اور بھنی ہوئی مہمانوں کے سامنے لا کر رکھی جاتی ہیں۔ ہر قسم کی سبزی اور ترکاری موجود ہوتی ہے، طرح طرح سے پکا ہوا گوشت پیش کیا جاتا ہے، برف کی طرح سفید منوں چاول، مرغیاں، انگور، سنترے، شراب یہ سب چیزیں ہمارے غلام بڑی مقدار میں لے لے کر مہمانوں کے سامنے لاتے تھے، اور آن کی آن میں وہ ختم ہو جاتی تھیں، دستر خوان پر گفتگو کرنا بدتمیزی میں داخل تھا۔ لہذا ہر شخص پورے انہماک سے کھانے میں مصروف تھا۔ تاکہ میزبان کو یہ خیال نہ گذرے کہ کھانا بدمزہ ہے اور وہ جی لگا کر نہیں کھا رہا۔ پھر شراب کا دور چلنا شروع ہوا۔ جام پر جام چڑھائے گئے اور لوگ بڑے ہال میں جمع ہو گئے، یہاں فرش بچھا تھا، خوبصورت اور قیمتی تکیے دیواروں سے لگے ہوئے تھے، لوگ آ کر آرام سے بیٹھ گئے۔ اور یہ مجمع بے تکلف بہت جلد محفل رقص و سرود میں تبدیل ہو گیا۔ لوگ کورس کی صورت میں گا رہے تھے، کوئی شخص نہ تھا جو اس نغمہ طرازی میں حصہ نہ لے رہا ہو۔ ہال کے اندر کی یہ آوازیں ہال سے باہر اس طرح محسوس ہوتیں جیسے طوفان آیا ہوا ہے اور ہوا کی سائیں سائیں فضا پر چھائی ہوئی ہے۔

کچھ دیر کے بعد دلہن سسرال چلی گئی۔ اس تقریب میں شرکت کے لئے جو عزیز اور رشتہ دار آتے تھے، وہ جلوس کی صورت میں دولہا کی سرحد تک اسے پہنچانے

گئے، پھر فضا میں الوداعی فائر کرکے اور خدا حافظ کہہ کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔
کئی دن تک جب تک آخری مہمان بھی ہمارے گھر سے رخصت نہیں ہو گیا جشن و دعوت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح کئی ہفتے کے بعد ہمیں حسب معمول تکلف سے بری سادہ زندگی بسر کرنے کا موقع پھر ملا۔

---

(۳)

ناگہانی حملہ

بہن کی شادی کو کئی مہینے گذر چکے تھے۔ والدہ ان کے فراق میں نیم جان ہو رہی تھیں۔ خود میرا حال بھی غیر تھا۔ ہم نے صرف فراق کا نام سنا تھا۔ اب معلوم ہُوا یہ کتنی اذیت ناک چیز ہوتی ہے۔ مجھے پریشان دیکھ کر والدہ بھی ملول اور افسردہ ہو جایا کرتی تھیں، آخر ایک روز صلاح یہ ٹھہری کہ چند روز کے لئے بہن کے سسرال ہو آئیں۔ اس طرح میرا جی بھی بہل جائے گا، اور والدہ کے قلب ناتواں کو سکون بھی مل جائے گا۔

مجھ پر تو شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ بچھڑی ہوئی بہن سے ملنے کی خوشی حدِ بیان سے باہر تھی۔ میں جلدی جلدی سامان ٹھیک کرنے لگی۔ صرف اتنا سامان لے جانا چاہتی تھی جو ایک ہفتہ یعنی وہاں کی مدتِ قیام تک کام دے سکے۔ نئے نئے اور خوبصورت کپڑوں کا ایک ڈھیر سامنے لگا ہُوا تھا۔ حیران تھی کسے لوں اور کسے چھوڑ دوں۔ بہرحال چند نئے اور خوبصورت جوڑے میں نے الگ کر لئے زیورات کا ڈبہ بھی الگ رکھ لیا۔ اپنے نئے عزیزوں کے لئے کچھ تحائف بھی

والدہ نے یہ ہمت بندھانے والے الفاظ کہہ تو دیئے، لیکن میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں، خطرہ کی شدّت کو انھوں نے محسوس کر لیا تھا، ان کی یہ کیفیت دیکھ کر مجھ پر دہشت غالب آگئی، میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

ہمارے آس پاس کی پہاڑیاں اور وادیاں بڑی پرسکون نظر آتی تھیں، لیکن ان کے پیچھے حدِ نظر سے دور دور جنگل قزاقوں اور رہزنوں کے گروہ موقع کی تاک میں ادھر اُدھر گھوما کرتے تھے۔ اسی طرح حریف قبائل کے سردار اپنے جانبازوں کے ساتھ نظروں سے چھپتے ہوئے، یہاں اور وہاں بھٹکتے رہتے تھے، یکایک میرے دل میں خیال آیا، قبل اس کے کہ ہماری بھیجی ہوئی اطلاع عزیزوں اور رشتہ داروں تک پہنچ سکے، اور ضروری امداد ہمیں حاصل ہو سکے۔ اگر رہزنوں کا کوئی گروہ، یا کسی حریف سردار کا جتھہ ہم پر ٹوٹ پڑا تو کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر میرا بدن کانپنے لگا۔

والدہ نے میری یہ کیفیت بھانپ لی، ان پر خوف اور دہشت کی جو کیفیت طاری تھی اس پر وہ غالب آگئیں، انھوں نے فوراً چند سواروں کو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے پاس یہ خبر پہنچانے کے لئے بھیج دیا، پھر مجھ سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! اب تو تو مطمئن ہو گئی؟"

مطمئن تو کیا ہوتی! لیکن والدہ کا یہ حال بھی دیکھا نہیں جاتا تھا، انھیں مطمئن کرنے کے لئے میں نے کہہ دیا

"جی! اب میں بالکل مطمئن ہوں۔"

میرے یہ الفاظ کارگر ہوئے۔ اور والدہ سکونِ خاطر کے ساتھ سامانِ سفر ٹھیک کرنے میں یدیرٰہ کا ہاتھ بٹانے لگیں، بہن کے سسرال والوں کے لئے جو تحائف لے جانا تھے، وہ انھوں نے الگ احتیاط سے رکھ لئے۔

والدہ اپنے کام میں مصروف تھیں، اور میرے دل میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا

کاش میں لڑکا ہوتی! تو اس نازک وقت پر دشمنوں اور رہزنوں کے لئے میں سدّ سکندری ثابت ہوتی، میرا دل کیوں گھبرا رہا ہے؟ میں کیوں پریشان ہوں؟ مجھ پر دہشت، خوف اور مایوسی کی کیفیت کیوں طاری ہے؟ کیا اس لئے نہیں کہ میں ایک لڑکی ہوں! میرا دل کمزور ہے! والد نے مجھے ران سواری اور تاور اندازی کی تعلیم دی تھی، اپنے ہم وطنوں کی طرح میں گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو سکتی تھی اور اسی حالت میں آدمی کے سر پر رکھے ہوئے اخروٹ کو اپنی گولی کا نشانہ بنا سکتی تھی، یہ سوچ کر میری غیرت بیدار ہوئی، میرے اندر حوصلہ پیدا ہوا، میں نے اپنے دل سے کہا، کہ اگر دشمن نے ہماری حویلی کے اندر قدم رکھا، خواہ وہ ڈاکو ہو یا کسی حریف قبیلے کا سردار، میں دکھا دوں گی کہ ایک لڑکی ہو کر بھی میں کس طرح ان کے چھکے چھڑا سکتی ہوں۔

نیم دلی کیساتھ سامان سفر کی تیاری جاری تھی، والدہ کی دل خوش کن اور حوصلہ افزا باتوں سے میں مبتلائے فریب نہیں ہوئی۔ صورت حال کی نزاکت، اور پیش آنے والے خطرہ کا مجھے پورا احساس تھا۔ جیسے میرے دل میں بیٹھا کوئی کہہ رہا تھا۔

"کچھ ہونے والا ہے، کچھ ہو کر رہے گا ——— بہت جلد! —
شاید ہمارے اندیشہ سے بھی پہلے "

سامان سفر بندھ گیا۔

میں ڈرائینگ روم میں پہنچی اور لباس تبدیل کرنے لگی، نیا لباس پہن کر ہمیشہ میرے دل میں خوشی کی لہریں اٹھنے لگتی تھیں۔ آج میں نے سب سے زیادہ قیمتی اور خوبصورت جوڑا پہنا تھا، نیلم، یاقوت، پکھراج اور موتی سے جڑے ہوئے زیورات میں نے زیب تن کئے ہوئے تھے، کوئی دوسرا وقت ہوتا تو ضرور میں گنگنانے لگتی، گانے لگتی، ہنستی اور مسکراتی، لیکن اس وقت؟ ——— مجھ پر ایسی سنجیدگی طاری تھی، جیسے میں ایک نوجوان دوشیزہ نہیں! ستر برس کی بڑھیا ہوں۔

کے چہرے پر خون کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ وہ اتنی ہراساں اور پریشان نظر آ رہی تھیں، کہ الفاظ کے ذریعہ وہ کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔

میں نے سراپا اضطراب بن کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟"

والدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا، اور میرے کندھے سے ٹیک لگائی شاید انہیں اندیشہ تھا کہ کھڑی نہیں ہو سکیں گی، گر پڑیں گی۔ یہ کیفیت دیکھ کر میں اپنے حواس کھو بیٹھی۔

"خدا کے لئے بتا دیجئے! کیا آپ بیمار ہیں کچھ؟"

والدہ اسی طرح کھڑی رہی۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

یکایک بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی، پھر شور و غوغا کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ اتنے میں دیکھتی کیا ہوں کہ گھر کی باندیاں دوڑی دوڑی آ رہی ہیں، انہوں نے آتے ہی ہاتھ جوڑ کر ہم سے کہا۔

"للہ! یہاں نہ ٹھہریئے! اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیے۔"

میں نے پوچھا۔ اور یہ جانتے ہوئے پوچھا کہ جواب کیا ملے گا؟

"آخر کیا بات ہے؟"

جواب وہی ملا جس کی مجھے توقع تھی۔

"حملہ ہے ——————— حملہ آور اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔"

میں نے باآواز بلند کہا۔

"اگر ہمیں شکست ہوئی تو اس مکان کے ساتھ ہم بھی خاک کے ڈھیر بن جائیں گے۔"

اس وقت میری رگوں میں وہی خون دوڑ رہا تھا جس کی شجاعت اور بہادری ضرب المثل

میرے گھر کی باندیاں بھی کافی ہراساں اور پژمردہ نظر آ رہی تھیں، ہم خوب جانتے تھے کہ دشمن کا حملہ کتنا تیز، کتنا مہلک اور خون ریز ہوتا ہے! — ان باندیوں میں سے کئی ایسی تھیں، جن کی آنکھوں نے قتل و غارت اور کشت و خون کے دلدوز اور جگر فگار مناظر کئی مرتبہ دیکھے تھے۔ میری طرح یہ بھی سوچ رہی تھیں کہ اگر واقعی دشمن نے حملہ کر دیا تو کیا ہو گا؟ یہ باندیاں ابھی جوانی کی منزل سے آگے نہیں بڑھی تھیں، ان میں اتنی رعنائی اور جاذبیت تھی کہ بڑی آسانی سے کاکیشیا کے بازارِ غلاماں میں منہ مانگے داموں پر فروخت ہو سکتی تھیں ——— کھلے بازار میں ——— جیسے گائیں اور بھیڑیں بیچی جاتی ہیں، جہاں پہنچنے کے بعد ہر امید اور آرزو دم توڑ دیتی ہے۔

میرے دل میں طرح طرح کے وہم آ رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا، خوشی روٹھ چکی ہے اور غم نے ڈیرا ڈال لیا ہے، میرے دل میں اب خوشی اور ترنگ نہیں تھی۔ خوف تھا، دہشت تھی، میں سوچ رہی تھی، کیا اس حالت میں ہمیں گھر سے باہر جانا چاہئے، کم از کم اپنے بارے میں تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں نہیں جاؤں گی، میرے والد، خدا انھیں جنت الفردوس عطا فرمائے، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو کیا اس حویلی کو خطرہ کے حوالے کر کے چلے جاتے؟ نہیں! ایسا ہرگز نہ ہوتا، وہ یہیں رہتے اور ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرتے، خواہ اس کی تعداد زیادہ ہوتی یا کم۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ والدہ کے پاس جا کر اپنے اس ارادہ کی انہیں اطلاع دے دوں۔ اور پھر پیش آنے والے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر طرح سے تیار ہو جاؤں، میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے بارے میں لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملے۔

"کاش! نشاط لڑکی کے بجائے لڑکا ہوتی!"

میں ڈرائنگ روم سے باہر نکلی، کاری ڈور میں تھوڑی دور گئی ہونگی کہ والدہ آتی ہوئی مل گئیں، وہ بالکل خاموش تھیں، مہر بلب! لیکن ان کا چہرہ سب کچھ بتا رہا تھا، ان

تھوڑی دیر کے بعد دشمن ہماری حویلی میں داخل ہوگیا۔ ہنستا، قہقہے لگاتا، اور فتح و کامرانی کے نعرے بلند کرتا وہ بڑھتا چلا آرہا تھا۔ بندوق میرے ہاتھ میں تھی اور میں دھڑا دھڑ گولیاں چلا رہی تھی۔ ہماری فائرنگ نے دشمن کے چھکے چھڑا دیئے، لیکن وہ نقصان اٹھاتا ہوا برابر آگے بڑھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زمین سے دشمنوں کی صفیں اُگ رہی ہیں۔ شور، غل، ہنگامہ، نعرے، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ فضا میں دشنام و التجا کے الفاظ گونج رہے تھے، اضطراب اور بے قراری کے عالم میں لوگوں کے منہ سے یا تو اللہ کا لفظ نکلتا تھا یا آہ اور واہ کے الفاظ!

اتنے میں ایک غلام دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ دہشت اور خوف کے باعث میری والدہ اس دنیا سے رخصت ہوگئیں، میں نے یہ الفاظ سنے لیکن پورے طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔ میرا بدن کانپنے لگا، میرا دل دھڑکنے لگا۔ میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ نگاہِ تصور میں میری ماں کی تصویر آبسی خستہ اور درماندہ، زار و نزار ضعیف و نحیف۔

عزیزوں اور رشتہ داروں کے پاس جو اطلاع بھیجی گئی تھی اس کا کوئی جواب اب تک نہیں آیا تھا۔ جنگ کا سارا بوجھ ہمارے کندھوں پر تھا۔ خواہ جیتیں یا لڑتے لڑتے اپنی جان دے دیں، جو کچھ کرنا تھا ہمیں کو کرنا تھا، اپنے حوصلے اور قوتِ بازو کے بل پر۔

دشمن اب قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہمارے آدمیوں نے حقِ وفا ادا کر دیا۔ ان کی کٹی ہوئی گردنیں اور بے گور و کفن لاشیں دیکھ کر دل دہل اٹھتا تھا۔

یہ ایسا وقت تھا کہ میرے دل میں کئی مرتبہ یہ خیال آیا کہ بندوق کی نالی دشمن کی طرف سے ہٹا کر اپنے سینے کی طرف کر دوں اور اس طرح اپنی ناکام زندگی کا خاتمہ کر ڈالوں، لیکن جس بہادری سے ہمارے آدمیوں نے دشمن سے اس کی کثرت

کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے باندیوں سے کہا۔

"والدہ کی حفاظت کرو، خبردار انہیں کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچے!"

یہ کہہ کر میں نے اپنی زار و نزار ماں کو پیار کیا اور دوڑی دوڑی اپنے کمرہ میں گئی۔ وہاں سے خنجر اور پستول اٹھایا اور باہر نکلی، اتنے میں کچھ خادموں نے آکر اطلاع دی کہ حملہ آور ہماری مورچہ بندی کو توڑ کر حویلی کے احاطہ میں داخل ہو گئے ہیں۔

ان خادموں اور غلاموں میں سے ہر شخص پوزیشن لے کر ان سوراخوں کے سامنے جا کر بیٹھ گیا جہاں سے بآسانی باہر کی طرف فائر کئے جا سکتے تھے، میں اس جگہ بیٹھی جہاں ایسے موقعوں پر والد بیٹھا کرتے تھے۔ مجھے یہاں بیٹھے دیکھ کر کسی نے بھی حیرت کا اظہار نہیں کیا، سب جانتے تھے میں کس باپ کی بیٹی ہوں!

حملہ آوروں میں اور ہمارے آدمیوں میں جنگ زور شور سے جاری تھی، سر کٹ رہے تھے، دھڑ گر رہے تھے، دردناک چیخوں کی آواز فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ ہر طرف سے آہ و بکا اور فریاد و شیون کا سلسلہ جاری تھا۔ ہمارے آدمی بہادری میں یکتا تھے، اور بڑی دلیری کے ساتھ لڑ رہے تھے، ہمیں بچانے کے لئے انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ ان میں سے ہر شخص خوشی اور مسرت کے ساتھ موت کا استقبال کر رہا تھا، اس بات پر اسے فخر تھا کہ وہ اپنے آقا کی حفاظت میں جان دے رہا ہے۔

میں جھروکے میں بیٹھی حالات کا مشاہدہ کر رہی تھی، میں نے دیکھا دشمن کی تعداد ہمارے آدمیوں سے کہیں زیادہ ہے، وہ ان کی مزاحمت کو کچلتا اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد کیا تھی، اس کا میں اندازہ نہیں کر سکی۔ ہمارے آدمیوں کی مزاحمت ان کی کثرت تعداد اور قوت کے سامنے دم توڑنے لگی لیکن مجھ پر خوف و دہشت کا کوئی اثر نہیں تھا۔ گویا والد کی ساری بہادری سمٹ کر میری ذات میں جمع ہو گئی تھی۔

(۴)

باندی

صبح طلوع ہوئی۔

لیکن یہ عجیب اور نئی صبح تھی۔

میں نے اپنی آنکھیں کھولیں، چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔ میری نگاہ کسی مانوس اور آشنا چیز سے انہیں ٹکرائی۔ نہ وہ پہاڑیاں تھیں، نہ وہ جنگل، نہ وہ وادی۔

میں نے غور کیا تو ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی ریگزار کے نخلستان میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ میرے قریب ہی ایک جھاڑی تھی، جہاں تین عورتیں بیٹھی تھیں اور ایک پیر مرد، میرے کانوں میں ان کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ یہ لوگ اپنے رشتہ داروں کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ جو ان حملہ آوروں کی دست برد سے محفوظ رہ گئے تھے۔

چٹان کی ایک مستطیل چوکی سی قدرت کے کاریگر نے بنا رکھی تھی۔ اس کے پیچھے کئی نوجوان آدمی بیٹھے تھے۔ انہیں رسیوں کی جکڑ بند سے عارضی طور پر آزاد کر دیا گیا تھا، تاکہ جو کھانا ان کے سامنے رکھا گیا ہے۔ اسے کھا سکیں۔ میرے سامنے ایک پیالہ شوربے کا رکھا تھا لیکن بیہوشی کی حالت میں اس طرف کیا توجہ کرتی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ رکھے رکھے خراب ہو گیا اور اب اسے واپس لے جایا گیا۔

تعداد کے باوجود دست بدست جنگ کی تھی، اس نے خودکشی کے بجائے لڑتے لڑتے مرنے کی اُمنگ میرے دل میں پیدا کر دی۔ ہمارے آدمیوں کی تعداد کم سے کمتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن کسی نے بھاگنے کا نام نہ لیا۔ کسی نے پیٹھ نہیں دکھائی، وہ لڑ رہے تھے اور کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ میری بندوق بھی اپنا کام کر رہی تھی، اور اب تک نہ جانے کتنے آدمیوں کو ہلاک کر چکی تھی ـــــــــــــــــــ لیکن اب کارتوس ختم ہو چکے تھے، میں اپنے حجرے سے باہر نکلی، خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ لڑائی بندوق کی بجائے خنجر سے جاری رکھوں گی۔ یکایک دشمن کے کسی آدمی نے مجھ پر وار کیا، میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا، میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

ہو گئی، اتنے میں ایک ٹیس سی میں نے اپنے پہلو میں محسوس کی، شاید یہ کسی زخم کی چبک تھی۔ میں کتنی زخمی تھی، اس کا اندازہ کرنے کا مجھے اب تک موقع ہی نہیں ملا تھا۔

اتنے میں کچھ لوگوں کی آوازیں میرے کان کے پردہ سے ٹکرانے لگیں میں سہم گئی، ہراساں اور سراسیمہ نظر آنے لگی، رہ رہ کر دل میں یہ خیال پیدا ہوتا۔

یہ کون لوگ ہیں؟

میرا انجام کیا ہوگا؟

میرے ساتھ ان لوگوں کا برتاؤ کس نوعیت کا ہوگا؟

پھر میں نے اپنے دل میں کہا۔ یہ کوئی لوگ بھی ہوں۔ تندرست اور توانا ہوتی تو بھی اس کی گرفت سے نکلنا آسان نہ تھا، اور اب زخموں سے چور، غموں سے نڈھال ہو رہی ہوں، کس طرح راہ فرار اختیار کر سکتی، اور فرض کرو، خدا مجھے ہمت دے اور ان بدمعاشوں کے چنگل سے کسی طرح نجات بھی پا جاؤں تو اس بے آب و گیاہ ریگستان میں، جہاں پانی کا ایک قطرہ دس اشرفیوں کے عوض بھی نہیں مل سکتا، کہاں جاؤں گی؟ کیا کروں گی؟ کس طرح زندگی بسر کروں گی؟ کاش مجھ میں اتنی سکت ہوتی کہ میں اپنا مقدر خود بنا سکتی۔

خوش قسمتی سے کمزوری مجھ پر اتنی غالب آئی کہ ناتوانی کے عالم میں جیسے ہی آنکھیں بند کیں غافل ہو گئی، تن بدن کا ہوش نہ رہا،

مجھے نہیں معلوم۔ کتنے گھنٹے یا کتنے دن۔ یا کتنے ہفتے میں سوتی رہی، لیکن جب آنکھ کھلی تو پہلے کے مقابلہ میں اپنے آپ کو زیادہ چاق و چوبند محسوس کر رہی تھی، جو مصائب گذر چکے تھے افسانۂ ماضی کی طرح ان کی یاد دھندلی ہو چلی تھی۔

کچھ دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے خیمے کے باہر سامان لادا جا رہا ہے،

سورج چمک رہا تھا۔

تمازت حدِ برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی، پسینہ تھا کہ فوارے کی طرح پھوٹ رہا تھا، میرے کپڑے بدن سے چپک گئے، ادھر ادھر خون کے دھبے اور نشانات بھی تھے، اب مجھے یاد آیا کہ ہمارے قبیلہ پر حملہ ہوا تھا، اسی دوران میں میری ناتواں ماں جان سے گزر گئی تھیں، میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ مر کر وہ دشمن کے ہاتھ آنے سے اور ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنے سے بچ گئیں۔

مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ حملہ آور سردار یعقوب اور اس کے آدمی نہیں تھے، بلکہ بے رحم اور درندہ خو ڈاکوؤں کا گروہ تھا جس کا کام ہی یہ تھا کہ اچانک پرامن اور مطمئن گھروں پر حملہ کرے، مال و دولت لوٹ لے، مردوں اور عورتوں کو گرفتار کرلے، اور پھر انھیں بازارِ غلاماں میں جا کر فروخت کر دے۔

میں اس طرح میں بیٹھی تھی کہ ایک لونڈی میرے پاس آئی اس نے میرے سامنے صحرائی شراب کا بنا ہوا ایک جام رکھ دیا، اور بولی۔

"اسے پی لو مزہ دے جائے گی"

میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا،

وہ لونڈی قہقہہ مار کر ہنسی اور چلی گئی۔ تمسخر اور استہزا کے رنگ میں وہ بار بار پیچھے مڑ کر مجھے دیکھتی ہے، اس کے سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا جب وہ ہنستی تو اس کھڑکی کی راہ سے ہوا چوسنے کی کوشش کرتی، اس منظر سے وہ اور زیادہ گھناؤنی نظر آنے لگتی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ چار عورتوں کی فوج لے کر میرے پاس آئی، کچھ کھانے کی چیزیں سامنے رکھ دیں اور کہا۔

"خیریت چاہتی ہو تو کھا لو، ورنہ ہم زبردستی بھی کرنا جانتے ہیں" میں بے بس

خیمے اکھاڑے جا رہے ہیں میں سمجھ گئی کہ قافلہ یہاں سے آگے بڑھے گا۔ زین سے کسے ہوئے خچر اور ٹٹو کافی تعداد میں تیار کھڑے تھے ــــــــــــ قیدیوں کے ہجوم میں جو اپنے اپنے خیموں سے نکل کر سامنے کی طرف جمع ہو رہے تھے، میں کیا کہوں یہ دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی کہ ہماری ایرانی باندی یدیزؔ بھی موجود تھی، یدیز کے بجائے اس وقت اگر میری ماں مجھے زندہ ہو کر مل جاتی تو بھی شائد میں اتنی مسرور نہ ہوتی، جتنا یدیز کو دیکھ کر ہوئی اور گو وہ بھی اس وقت ایک قیدی تھی، اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے، اور ہر طرح وہ بے بس تھی پھر بھی اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا، وہ مجھ سے زیادہ دُور نہیں، چند قدم کے فاصلہ پر تھی، اس کی نگاہوں کا پیام میں نے پڑھ لیا۔ اس پیام میں کتنا درد تھا، کتنا سوز تھا، کتنی ہمدردی تھی، کتنی وفاکیشی تھی، یہ بھی قدرت کی نیرنگی تھی، کہ اس وقت میں سب سے زیادہ جس کی شکور نظر آ رہی تھی اور جسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی وہ میری باندی تھی گذشتہ زندگی اور میری موجودہ پوزیشن، دونوں میری نظر میں ہیچ تھیں، میں نے محسوس کر لیا تھا، میں بھی ایک باندی ہوں ــــــــــــ معلوم نہیں کس کی، ایک باندی ــــــــــــ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے خدا کا شکریہ ادا کیا کہ ذلت و خواری کے یہ دن دیکھنے کے لئے میری ماں زندہ نہیں رہی تھی مالک! شکر ہے تیرا!

---

(۵)

میری وفادار ایرانی کنیز

رہزنوں کی تیاریاں اور چوکسی دیکھ کر یہ بات صاف نظر آ رہی تھی، کہ ہم میں سے کوئی شخص بھی بھاگ کر اپنی جان نہیں بچا سکتا، تنی کڑی نگرانی، کہ ایک قدم بھی چلنا دشوار۔

ایک خادم میرے پاس آیا اس نے مجھ سے پوچھا،

"کیا آپ پیدل چل سکیں گی؟"

میں نے بے بسی کی نظر سے اُسے دیکھا اور کہا:

"یہ تو بتاؤ کہ ہم کہاں ہیں؟ کس طرف جائیں گے؟ ہماری منزلِ مقصود کیا ہے؟"

خادم نے نہائیت سنجیدگی سے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"مہربانی کر کے ایسے سوالات نہ کیجئے! ہم کہاں ہیں؟ اور کہاں جائیں گے؟ اس بارے میں آقا ہی کچھ کہہ سکتے ہیں!"

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہمارا خود ساختہ "آقا" بھی آموجود ہوا۔ وہ دیلن عمانیپ کا ایک نہایت بھاری بھرکم شخص تھا، نہائیت گندہ اور گھناؤنا، نہائیت مکروہ

اور بدصورت، نہایت بدزبان اور بد دماغ، وہ صرف ایک لفظ میں اپنا مدعا بیان کرتا تھا، خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔ اس گروہ کے ہر آدمی کا یہ فرض تھا کہ آنکھ بند کر کے اس کے احکام کی تعمیل کرے۔ گروہ کے کسی آدمی کو ایک مرتبہ سے زیادہ اس کے سامنے بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا اور بھدا سا کوڑا تھا، یہ ہر وقت اس کے پاس رہتا تھا، ضرورت ہو یا نہ ہو، بطور شغل کے غلاموں کی پیٹھ پر یہ کوڑا برابر برستا رہتا تھا، یہ غلام خواہ مرد ہو یا عورت، مرد کی سختی اور عورت کی نزاکت دونوں چیزیں اس کے سامنے برابر تھیں۔ ان غلاموں اور باندیوں پر جب کوڑے برستے تھے تو ان کی آہ و فریاد کا شور آسمان تک جاتا تھا، ایسے جگر نگار اور دل دوز نالے میں نے کاہے کو کبھی سنے تھے، میرا بدن لرزنے لگتا، ایسا معلوم ہوتا جیسے میں بے ہوش ہو جاؤں گی سزا دیتے وقت یہ ظالم اور سفاک آتا اتنا بھیانک نظر آتا تھا، کہ اگر شیر بھی اسے دیکھ لیتا تو اس کا پتا پانی ہو جاتا، اس کے خد و خال، اس کے انداز و اطوار، اس کے طور طریقے سب بھیانک تھے، حد یہ ہے کہ جب وہ ہنستا اور قہقہے لگاتا تھا، تو اور زیادہ ڈراؤنا اور ہیبت ناک نظر آنے لگتا تھا، یہ فضا، یہ ماحول، یہ رنگ اور یہ ڈھنگ دیکھ کر میرے دل سے صرف ایک ہی دعا نکلتی تھی ——— اے خدا مجھے موت دے۔

کاش! حملے کے دوران میں اپنی والدہ کے ساتھ میں بھی مر گئی ہوتی!

بیدیز

مجھے بیدیز سے گفت گو کرنے کی اجازت نہیں تھی

میری وہی ایرانی باندی، اور آہ، اب میری ہم قسمت! وہ بھی باندی تھی اور میں بھی، وہ بھی کسی کی تابع فرمان تھی اور میں بھی، بار بار میرے دل میں خیال پیدا ہوتا اور یہ سوچ کر میں کانپ جاتی کہ ہمارا انجام کیا ہوگا؟ خاص طور پر میرا — ؟ محنت، مشقت کا کام میرے بس کا روگ نہ تھا، سفر کے سوا اب تک ہمیں کوئی کام کرنا

نہیں پڑتا تھا۔ کبھی ٹٹو پر سوار ہو جاتے، کبھی پا پیادہ چلنے لگتے۔ پانی کا ذخیرہ بہت محدود تھا۔ وہ صرف پینے اور کھانے پکانے کے کام میں لایا جاتا، وہ بھی انتہائی کفایت شعاری کے ساتھ۔ جب یہ منزل ختم ہو گئی تو تب ہم کیا کریں گے۔ ہمارا کیا حشر ہو گا۔ یہ ایسا سوال تھا جس کا کوئی جواب سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس گروہ میں غلاموں اور باندیوں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی لیکن اپنے مرتبہ کے لحاظ سے میں یکتا تھی۔ کوئی دوسری لونڈی میری طرح کسی بہت اونچے خاندان کی موجود نہ تھی۔ دوسری باندیاں میرے اور بیدیز کے مقابلہ میں زیادہ مسرور اور شاداں نظر آتی تھیں شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ وہ غلامی میں پختہ تر ہو چکی تھیں۔

ہم میں سے چھ عورتیں ایک خیمے میں بسیرا لیتی تھیں۔ رات کو میرا یہ معمول تھا کہ میں جلدی سے لیٹ جاتی اور سوتی بن جاتی تاکہ ان عورتوں کی باتیں سن سکوں بڑے مزے کی اور بڑی دلچسپ باتیں رات کے سناٹے میں یہ کیا کرتی تھیں۔

کچھ عرصہ بعد دو دو عورتیں ایک ایک خیمہ میں رکھی جانے لگیں میں نے محسوس کیا کہ وسط ایشیا کے کسی بازار غلاماں کی طرف ہم لوگ لے جائے جا رہے ہیں۔ جہاں پہنچنے کے بعد دوسروں کے ساتھ میں بھی فروخت کر دی جاؤنگی اور پھر ساری زندگی ایک باندی کی حیثیت سے مجھے بسر کرنا پڑے گی میری باقی ماندہ پانچ سہیلیاں آپس میں خوب ہنسی مذاق اور چہلیں کیا کرتی تھیں اور اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں طرح طرح کے نقشے تیار کیا کرتی تھیں۔ ان کی باتیں زیادہ تر اس مسئلہ پر ہوتیں کہ،

"کون ہمیں خریدے گا؟"

"ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟"

"ہمارا خریدار خوبصورت ہو گا یا بدصورت؟ جوان ہوگا یا بوڑھا؟ تندرست ہوگا یا بیمار؟ دولت مند ہوگا یا غریب؟ ——— یہ باتیں سن کر میری روح لرز

جاتی۔ میں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی، کہ یہ الفاظ نہ سن سکوں، لیکن قسمت کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے، یہ ساری تدبیریں بیکار جاتیں اور مجھے سب کچھ سننا پڑتا۔

ہر روز جب نیا دن شروع ہوتا تو ہماری جانکنی کا عالم کچھ اور بڑھ جاتا۔

ہر دن جب ختم ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا، جیسے نزاع کا عالم ہم پر طاری ہے۔

ہم سوچنے لگتے کل کیا ہوگا۔؟

کیا ہماری منزل مقصود قریب آگئی ہے۔؟

کیا یہ آخری رات ہے جو ہماری اپنی ہے اور کل سے ہمارے شب و روز کسی آقا کے تصرف میں ہوں گے؟

میں اپنے دل سے پوچھتی، فرض کرو، کوئی گاہک آیا اور اس نے مجھے خرید لیا پھر کیا ہوگا؟ پھر میری زندگی کس دھرّے پر چلے گی۔؟

میں خوش تھی کہ میری ماں یہ دن دیکھنے کے لئے زندہ نہیں تھی۔ رسوائی اور خواری ذلت اور مسکنت، تباہی اور بربادی کا یہ سارا بوجھ صرف میرے کندھے پر تھا، رسوائی میری تھی، بدنامی میری تھی، بربادی میری تھی! میری ماں ان مصیبتوں میں شریک نہیں تھی۔

ایک رات جب ہم سب اپنے خیموں میں جا چکے تھے اور آدھی سے زیادہ رات گذر چکی تھی تو ہمارا آقا اور اس کے ساتھی زور زور سے گانے میں مشغول ہو گئے، کوئی باجا بجاتا، کوئی تانیں اڑاتا۔ میں آہستہ آہستہ کھسکتی ہوئی لیٹے لیٹے خیمے کے دروازے پر پہنچی، میں نے دیکھا ایک بڑا سا الاؤ جل رہا ہے اور یہ لوگ اس کے گرد بیٹھے تانیں اڑا رہے ہیں، شراب سے بھرا ہوا ایک مٹکا سامنے رکھا تھا، باری باری ہر شخص گلاس بھرتا، اور غٹاغٹ چڑھا جاتا۔ نشہ جب بڑھا تو ان کی رنگ رلیوں میں بھی اضافہ ہوا۔ کسی نے کمر پر ہاتھ رکھ کر ناچنا شروع کیا، کوئی تالیاں بجا بجا کر تھرکنے لگا۔ میں نے دیکھا، کہ ہمارے گروہ کی چند باندیاں بھی رقص و نغمہ کی ان سرمستیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی

ہیں — میرا خیال ہے یہ پیشہ ور عورتیں تھیں، گرفتار بلا ہونے سے پہلے بھی ان کا کام ناچنا گانا ہی رہا ہو گا، یہ باندیاں مست و مخمور رہزنوں کی اس ٹولی میں اتنی خوشی اور مسرت سے حصہ لے رہی تھیں جیسے آج دل کی مراد انہیں مل گئی، یہ منظر دیکھ کر مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا، ایسا معلوم ہونے لگا جیسے میری روح نکل جا رہی ہے۔

میں نے سوچا اگر ان کم بختوں نے اپنی ٹولی کی رنگ رلیوں میں شرکت کے لئے مجھے بھی طلب کر لیا تو میں کیا کروں گی؟

میری حیثیت ایک قیدی ہی کی تو ہے! اور قیدی اپنے آقا کے حکم سے کوتاہی نہیں کر سکتا۔

میں نے سوچا، مجھے اپنا حوصلہ قائم رکھنا چاہیئے۔ اگر ان لوگوں کو میری دہشت زدگی اور سراسیمگی کا علم ہو گیا تو لطف و تفریح حاصل کرنے کے لئے یہ ضرور مجھے بلائیں گے۔

یکایک میں نے محسوس کیا کوئی میرے پیچھے کھڑا ہے۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا تاکہ میں چیخ نہ سکوں۔ اگرچہ یہ احتیاط بے کار تھی، کیونکہ اگر میں چیختی بھی تو بھی نشاط و طرب کے اس ہنگامہ میں میری آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جاتی۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنی گردن موڑی، دیکھتی کیا ہوں۔ پدیز کھڑی ہے، میری ایرانی باندی!

پدیز نے سرگوشی کے لہجہ میں مجھ سے کہا۔

"میری مالکہ، مجھے پورا اندازہ ہے کہ آپ کے حساس اور نازک دل و دماغ پر کیا کچھ گذر رہی ہوگی۔ پہرے کے سپاہی بھی اس وقت رنگ رلیوں میں مصروف ہیں، میرا خیمہ کے دروازہ پر صرف ایک سپاہی بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ میں اپنی جان خطرہ میں ڈال کر یہاں آئی ہوں۔ اگر کہیئے تو یہ موقع ہے کہ آپ کو یہاں سے نکال لے چلوں، لیکن یہ سوچ لیجئے کہ دور دور تک پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ملے گا۔ اور ہم لوگ پیاس سے تڑپ تڑپ

کر جان دے دینگے، بہر حال آپ کی خاطر ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ مجھے اگر یہ یقین ہو جائے کہ اپنی جان دے کر آپ کو بچا سکتی ہوں تو ایک لمحہ بھی تامل کئے بغیر میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہوں، صرف آپ کے اشارہ کی دیر ہے۔

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

پیریز اب تک اپنے آپ کو میری باندی سمجھ رہی تھی۔

میں ابتک اُس کی نظر میں آقا اور مالک ہوں۔

اس دنیا میں جنس وفا کس قدر نایاب ہے، لیکن قدرت نے کس فیاضی سے اس نازک اندام لڑکی کو یہ نعمت عطا کی ہے۔

میں نے کہا،

"میری پیاری پیریز! جو کچھ ہو رہا ہے اس میں خدا کا ہاتھ کام کر رہا ہے، ہم اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمیں اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے، اسی سے دعا کرنی چاہیئے۔!

پیریز جھکی اس نے میرے پاؤں پر آنکھیں رکھ دیں اور انہیں بوسے دینے لگی، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، وفا کی وہ پتلی واقعی میری نظر میں ملکان ہوتی جا رہی تھی۔

اتنے میں خرمستوں کی اس ٹولی سے شور و غوغا کی آواز اور زیادہ بلند ہونے لگی، مختلف سُروں اور لہجوں میں زور زور سے وہ گانے لگے۔ ڈھول اور تاشے پیٹے جا رہے تھے، بانسری بج رہی تھی، تانیں اڑ رہی تھیں، یہاں تک کہ یہ سارا نخلستان جہنم کا ایک طبقہ معلوم ہونے لگا۔

اندھیرے میں الاؤ کی روشنی اور اس روشنی کے اندر سے لپکتے ہوئے شعلے ایک بھیانک منظر پیش کر رہے تھے۔ اس منظر میں جانوروں کی طرح ان لوگوں کا اچھلنا کودنا

ناچنا گاتا ہنسنا اور قہقہے لگاتا، اتنا مہیب سماں پیدا کر رہا تھا کہ سچ کہتی ہوں، ایسا ہولناک، ایسا بھیانک منظر نہ صرف یہ کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، بلکہ اُس کا تصور بھی، نہیں کر سکتی تھی۔

"ڈلی کے کچھ لوگ پی کر اتنے مدہوش ہو گئے تھے کہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے اور اوندھے منہ گر پڑے، دوسرے ساتھی گرے تو نہیں لیکن مدہوش وہ بھی ہو رہے تھے۔"

پدیرز نے سرگوشی کے لہجہ میں مجھ سے کہا،

"اگر یہ سارے لوگ اسی طرح پی پی کر مدہوش ہو جائیں تو کتنی آسانی سے ہم اپنی جان بچا کر یہاں سے بھاگ سکتے ہیں۔"

میں نے اُسے جواب دیا،

"تمہارا خیال غلط ہے، ہم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے، گھنٹہ دو گھنٹے کے بعد صبح ہو جائے گی، یہ لوگ آنکھیں ملتے اٹھیں گے اور ہمیں نہ پا کر دیوانے ہو جائیں گے، دیوانہ وار یہ ہمارا تعاقب کریں گے، ہماری جستجو میں لگ جائیں گے، اور خدا ہم پر رحم کرے، یہ ضرور ہمیں پالیں گے۔ اور پدیرز جانتی ہو؟ اسکے بعد ہمارا کیا حشر ہوگا؟ وہی جو دوسروں کا دیکھتے آرہے ہیں، ہماری پیٹھ پر کوڑے پڑیں گے، ہمارے بدن پر مکوں اور گھونسوں کی بارش ہوگی، ان ہاتھوں سے جنہیں اپنے اندر قوت کا صحیح اندازہ نہیں ہے، جو نہیں جانتے کہ ان گھونسوں اور مکوں کی زد کھا کر دوسروں پر کیا گزرتی ہے، جنہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ مار پیٹ کا سلسلہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے کب بند کرنا چاہیئے۔"

رہزنوں کی اس ٹولی سے چند لوگ جو اب تک ہوش میں تھے اُٹھ کھڑے ہوئے اور شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے خیموں کی طرف روانہ ہو گئے۔

ٹولی کا سرغنہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں ہوشیار اور چوکنا تھا،

بھبک دار روٹی، ان چیزوں کا ایک لقمہ توڑنا بھی میرے لئے ناممکن تھا، جب بھوک بہت ستاتی، تو ایک گلاس بکری کا دودھ پی لیتی، ہمارے قافلہ کے ساتھ بکریوں کا ایک ریوڑ بھی چل رہا تھا، رفتہ رفتہ میں اس دودھ کی اتنی عادی ہوگئی کہ غذا کا خیال بھی نہ آتا جب بھوک لگتی، دودھ دوہا اور پی لیا۔

سارا دن ہم چلتے رہے، سہ پہر کے قریب ایک جگہ ہمارے قافلہ نے پڑاؤ کیا، ہم سے کہا گیا کہ تم سب لوگ ایک جگہ جمع ہو جاؤ، سردار تم سے کوئی باتیں کرنا چاہتا ہے۔

اتنی ساری شراب پینے کے بعد بھی اس نے اپنے حواس نہیں کھوئے تھے۔ ان لوگوں کو مد
دیکھ کر وہ بگڑ گیا۔ اس نے ایک مرتبہ للکار کر ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،
"تم لوگ اس قابل نہیں ہو کہ شراب پا سکو۔ شراب پی کر ہوش کھو دینا کم ظرفوں ک
کام ہوتا ہے۔ مجھے دیکھو، میں نے تم سب سے زیادہ پی ہے، لیکن کوئی اندازہ بھی نہیں
کر سکتا کہ ایک قطرہ بھی میرے حلق سے نیچے اترا ہو۔ تم لوگ شراب پینے کی اہلیت نہیں
رکھتے؛ ذرا سی پی اور جانوروں کی طرح ڈھیر ہو گئے، اگر ظرف نہیں ہے تو پیتے کیوں
ہو؟"

سرغنہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کل ہم لوگ اسکودر پہنچ جائیں گے، وہاں کی دلچسپیاں اور رنگینیاں زیادہ جوش
ہوں گی ان میں حصّہ لینے کے لئے ابھی سے اپنے آپ کو تیار کر لو!"

ڈلی کے لوگوں نے سردار کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں خیمے کے دروا
سے لگ کر بلکہ چپک کر کھڑی ہو گئی، بیریز میرے سامنے آ گئی، تاکہ ادھر سے گذر
والے شرابیوں کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکے مبادا وہ مجھے دیکھ لیں اور ان کی نیت بگڑ جا
ان لوگوں کے گذرنے کے بعد بیریز واپس چلی گئی۔ اس کو اندیشہ تھا، کہیں ا
کی غیر حاضری معلوم نہ کر لی جائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ وہ سزا پانے سے بچ سکے گ
میں! خدا کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ اب تک نہ صرف یہ کہ مجھے کوئی سزا نہیں ملی تھی، بلک
کے سامنے پیش ہونے کا موقع بھی نہیں آیا تھا۔

ہمارا کھانا ڈلی کے باورچی پکاتے تھے، معمولی برتنوں میں رکھ کر کھانا ہمار
سامنے رکھ دیا جاتا تھا، چھری کانٹے کے بجائے ہمیں انگلیوں سے کھانا پڑتا تھا لیکن ج
تک میرا تعلق تھا، مجھے اس کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ اس لئے کہ کھانا اتنا خراب اور بدر
ہوتا تھا کہ کبھی طبیعت اس طرف راغب ہی نہیں ہوئی۔ کالی کالی بوٹیاں، بے رنگ شو

(۶)

بازارِ غلاماں

ہم سب ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ مجھے نہیں معلوم دوسروں کی کیا کیفیت تھی، لیکن میرا یہ عالم تھا کہ میں لرز رہی تھی، میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، میرا منہ خشک ہو رہا تھا، گلے میں کوئی چیز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی، لیکن حوصلے سے کام لے کر میں اپنی کیفیت پر غالب آ گئی میں نے اپنی یہ حالت نہیں ظاہر ہونے دی۔

ٹولی کا سردار ہماری لمبی صف کے سامنے سے اکڑتا اور تنتا ہوا گزرا۔ کوڑا اس کے ہاتھ میں تھا، جسے گھما گھما کر وہ زمین پر ٹپک رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں روسی جوتے تھے، سر پر استراخانی ٹوپی، اس کا چہرہ اتنا ڈراؤنا اور بھیانک تھا کہ نظر جما کر اُسے دیکھتے رہنا ناممکن تھا، داہنی آنکھ کے اوپر ایک داغ سا تھا، چہرہ اتنا خوفناک کہ پہلی نظر میں اس پر کسی جن یا بھوت کا گمان ہوتا تھا۔

یکایک چلتے چلتے سردار رُک گیا۔ اس نے کہا میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایک گھنٹہ کے اندر ہم اکودر پہنچ جائیں گے۔ اور زیادہ سے زیادہ بولی دینے والے کے ہاتھ تم میں سے ہر ایک کو فروخت کر دیا جائے گا تم لوگ جلدی جلدی غسل کر لو، اور لباس تبدیل کر لو، تا کہ ہم ٹھیک وقت پر بازار غلاماں میں پہنچ سکیں۔

یہ کہہ کر سردار میری طرف مڑا، اور کہا۔

"کیا تمہیں ناچنا آتا ہے؟ ——— میرا خیال ہے تم بہت اچھا ناچ لیتی ہوگی۔"

مجھے تن بدن کا ہوش نہ تھا، میں زمین میں گڑی جا رہی تھی، کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتی، کاش یہ آسمان مجھ پر ٹوٹ پڑتا، میں نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"صرف وہ ناچ جانتی ہوں جو حارسیا میں مروّج ہیں۔"

"وہ ہنستے لگا،" اس نے کہا۔

"کافی ہے!"

پھر اس نے کوڑا ہاتھ میں لے کر اپنے گرد ایک حلقہ سا بنایا اور حکم دیا۔

"جاؤ، فوراً تیار ہو جاؤ۔"

واقعی ایک گھنٹے کے اندر ہم لوگ اپنی منزلِ مقصود یعنی اسکو در پہنچ گئے، یہاں پھر ہمیں نہانے دھونے اور لباس تبدیل کرنے کا حکم دیا گیا، شہر کے جس حصہ میں ہمارا پڑاؤ ہوا، یہ بڑا خراب اور گندہ حصہ تھا، مسافر اور سیاح جنہیں حمام جانے کی مقدرت نہ ہوتی، یہیں سرِ راہ نہا دھو لیا کرتے، کسی طرح کی پردہ داری کا کوئی انتظام نہ تھا، ساری عورتیں اور لڑکیاں اسی طرح کھلے آسمان کے نیچے فرش زمین پر کھڑی نہا رہی تھیں۔

اور یہاں بھی کہ پہرے داروں کی نگاہیں ہمارے جسم و روح میں پیوست ہو رہی تھیں، وفادار یدیزا آگے بڑھی اور میرے سامنے پردہ بن کر کھڑی گئی، تاکہ اس حالت میں مجھے کوئی دیکھ نہ سکے۔

یدیزا کی اس حرکت نے میرے دل میں اس کی عزت اور محبت دوچند کر دی، بظاہر میں نے اس سے کسی طرح کے ربط و میل جول کا اظہار ان لوگوں کے سامنے نہیں کیا، لیکن

میرا دل گڑگڑا گڑگڑا کر خدا سے دعا کر رہا تھا کہ ہم جدا نہ ہوں، جہاں بھی جائیں ایک ساتھ جائیں فروخت ہونے کے بعد کیا ہوگا؟ اسے میں نے نہیں سوچا، خدا جو کرے گا، وہی بہتر ہوگا لیکن بیدیز! اس سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر تیار ہوگئے، اب ہمیں حکم دیا گیا کہ سیدھے بازار غلاماں کی طرف چلیں۔

سہ پہر کا وقت تھا لیکن تمازت آفتاب کا یہ عالم تھا کہ جیسے دوپہر ہو، راستہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ چلتے چلتے ہمارے پاؤں سوج گئے۔

یہاں آکر ہمارے گروہ میں چار باندیوں کا اور اضافہ ہوا ہم پاپیادہ چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں باجے کی سامعہ خراش آواز کان کے پردے اڑائے دیتی تھی، شور و غل کا یہ عالم کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا یہاں کوئی میلہ ہے جس کی گہما گہمی اور کیفیت ہی عجیب ہے۔ ہمارے وطن میں بھی میلے ہوا کرتے تھے، ان میں زندگی نظر آتی تھی، اُمنگ نظر آتی تھی، لیکن یہ میلہ کتنا روح فرسا تھا جہاں قدم رکھتے جی ہچکچاتا اور روح لرزتی تھی۔

ہم ایک بڑے میدان میں داخل ہوگئے، پھر ایک اونچے پلیٹ فارم پر پہنچا دیئے گئے۔ یہاں گھوڑوں کا نیلام ہو رہا تھا جب تک آخری گھوڑا بھی نیلام نہیں ہو گیا، اور اس میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا ہم بیٹھے اپنی باری کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد ہم میں سے ایک عورت سامنے کھڑی ہوئی۔ لوگوں نے بولیاں دینا شروع کیں، آخر پانچ پونڈ پر معاملہ طے ہو گیا، اس کے بعد اور کئی عورتیں نیلام کے لئے پلیٹ فارم پر لائی گئیں۔ کسی کے زیادہ دام لگے کسی کے کم، لیکن باری باری سے وہ فروخت ہوتی چلی گئیں۔

اب میں نے دیکھا میری پیاری بیدیز لائی گئی، کئی لوگوں نے بولیاں بولیں، گھوڑوں کا ایک سوداگر آیا اس نے آٹھ پونڈ لگائے ——— بیدیز بک گئی!

اب میری باری آئی ۔

نیلام کرنے والوں نے میرے حسن وجمال کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا ملا کر لوگوں کو زیادہ سے زیادہ بولی بولنے کی ترغیب دی، میرا بدن کانپ رہا تھا، میرے اعصاب جواب دینے لگے تھے آنکھیں جھکی ہوئی تھیں کسی طرح ہمت بھی نہ پڑتی تھی کہ انہیں اٹھا سکوں ۔ چار پونڈ سے میری بولی شروع ہوئی، پھر ایک ایک پونڈ بڑھتے بڑھتے پندرہ تک پہنچی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی ــــــ کانپتے ہوئے بدن اور لرزتی ہوئی روح کے ساتھ میں نے دیکھا کہ ایک بے ڈھنگا، موٹا تازہ، کالا کلوٹا آدمی بجاری ٹولی کے سردار کے پاس پہنچا اور دونوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں ٭

---

(۷)

میری قیمت سو اشرفی

پدیزا اپنے نئے آقا کے ساتھ جا چکی تھی۔ اب اس وسیع دنیا میں میرا کوئی نہیں تھا۔ میں ایک باندی تھی جس کا نہ کوئی ہمدرد تھا، نہ غمگسار، سامنے وہ بھیانک آدمی کھڑا سردار سے سرگوشی کر رہا تھا جس کا تصور بھی میرے لئے رُوح فرسا تھا۔ اُسے دیکھ دیکھ کر میرا خون گھٹا جا رہا تھا، مجھے ایسے جھٹکے لگ رہے تھے، جیسے میں مر جاؤں گی، چربی سے بھرا ہُوا اس کا چوڑا چکلا چہرہ دیکھ کر میرے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ اتنا لمبا اور اتنا موٹا آدمی میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اتنے میں میرے کانوں میں آواز آئی۔

"یہ بک گئی —— سو اشرفیوں میں اس کا سودا ہو گیا!"

میں نیچے اُتری اور فوراً ہی اس سیاہ رو اور تیز ورول شخص کے حوالے کر دی گئی!

میرے پاؤں بغاوت کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ تعمیل حکم پر مجبور تھے، دل کہتا تھا، بھاگ جاؤں، عقل کہتی تھی، خیریت چاہتی ہو تو اس دیو کے پیچھے چلی چلو، اس شخص کے مقابلہ میں ٹولی کا سردار جسے اب تک میں بدصورت اور مکروہ سمجھتی رہی تھی، ایک

خوبصورت، طرح دار نوجوان نظر آنے لگا۔ یہ آدمی تو تھا، لیکن یہ میرا نیا خریدار! آہ، میرے خدا! وہ تو نہ جانے کیا تھا۔

خاموش اور لرزاں و ترساں میں اس دیو کے پیچھے چلتی رہی۔ راستہ بھر اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ یہاں تک کہ ہم گودی پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک چھوٹی سی کشتی تیار کھڑی تھی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے —— شاید بحر اسود کا ساحل تھا۔ جہاں سے نہ جانے میری قسمت مجھے کہاں لے جا رہی تھی!

میں نے اپنے خریدار سے پوچھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

میرے خریدار نے جواب دیا۔

"قسطنطنیہ! —— جہاں اپنے آقا کے حضور میں تمہیں پیش کروں گا!"

میں سوچنے لگی۔ مجھے کتنے آقاؤں سے پالا پڑے گا۔ ایک تو یہ خود ہے، دوسرا اس کا بھی آقا۔

آقا! —— کتنا مکروہ ہے یہ لفظ۔ اس لفظ سے مجھے جتنی نفرت تھی، میں بیان نہیں کر سکتی!

پھر دل میں ایک طرح کا سکون پیدا ہوا۔ یہ بدہیئت اور بدنما شخص میرا آقا نہیں تھا۔ میں اس کی باندی نہیں تھی۔ میرا آقا کوئی اور ہے! میں کسی اور کی باندی ہوں —— دیکھنا چاہیے وہ کیسا نظر آتا ہے۔

کشتی ہچکولے لیتی سمندر میں رواں دواں تھی۔ میں نے اس کالے آدمی سے پوچھا۔

"کچھ اپنی تعریف بھی تو کرو کہ تم کون ہو؟"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"سلطان ترکی کی حرم سرا میں جو حبیب خواجہ سرا ہے میں اُس کا مددگار بنا
"سلطان ترکی ———— میں نے یہ الفاظ آہستہ آہستہ دہرائے، ہر لفظ
پتھر کی طرح میرے ہونٹ سے ٹکرا رہا تھا۔ اس انکشاف سے میں اتنی حیران
ششدر ہوئی کہ پھر میرے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں لیٹ گئی۔ کشتی
ہچکولے کھا رہی تھی اور میرے خیالات بھی بحرِ الم میں ہچکولے کھا رہے تھے ——
کاش مجھ میں اتنا حوصلہ ہوتا کہ میں بحرِ اسود کی ان تڑپتی ہوئی موجوں کی آغوش میں
پہنچ جاتی۔

رات ہوتے ہوتے ہم قسطنطنیہ پہنچ گئے، یہاں کی مرطوب اور ٹھنڈی
میرے جھلسے ہوئے رخساروں پر نسیم بہار کی طرح پنکھا جھلنے لگی۔

ساحل کے پاس سمندر میں بہت سی کشتیاں اور بہت سے جہاز نظر آ رہے تھے
ان کے عرشوں سے نغمہ طرازی کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھی، ملاح وجد تو گیت
گانے میں مصروف تھے۔

ستارے ہمارے سروں پر چمک رہے تھے۔ خشکی پر اترنے کے بعد تنگ
تاریک گلیوں میں ہوتے ہوئے، مسجدوں کے بلند و بالا مینار، مقبروں کے اونچے اونچے
گنبد، اور فلک رفعت مکانات اس چاندنی میں عجیب بہار دکھا رہے تھے۔

میرے پاؤں سوج رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا، اب میں گر پڑوں گی
میں ہم ایک فٹن کے پاس پہنچے۔ مجھے حکم دیا گیا کہ میں اس میں بیٹھ جاؤں، میں اندر
اور فٹن کے مخملی گدے پر نہایت آرام کے ساتھ بیٹھ گئی۔

یہ قسطنطنیہ تھا! میں ایک آرام دہ فٹن میں بیٹھی ہوئی ایسا محسوس کر رہی
جیسے یہ کوئی جنت کا ٹکڑا ہے۔ اب نہ کوئی خوف تھا، نہ کوئی اندیشہ، نہ
نہ وحشت، نہ تکان نہ اضمحلال، تھوڑی دیر کیلئے میں یہ سب کچھ بھول گئی، چاند، چا

سیلاب بہہ رہا تھا، مسجد ایا صوفیہ کے بلند و بالا مینار ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے کسی نے چاندنی کی لاٹ کھڑی کر دی ہے۔ گھروں سے نغمہ طرازی کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں!

یکایک ایک دھچکے کے ساتھ بھاری فٹن رک گئی، وہ کالا آدمی اترا اور دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

(۸)

قصرِ یلدیز

وہ سیاہ رو شخص فشن کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا، اس نے آہستہ سے لیکن جمے ہوئے انداز میں کہا،

"یہ ہے قصر یلدیز کا راستہ!"

اگرچہ یہ اطلاع میرے لئے یکسر بے معنی تھی میں بالکل نہیں سمجھ سکی کہ قصرِ یلدیز کا مطلب کیا ہے۔ لیکن بہرحال ایک طرح کی آسودگی منزل کا احساس ضرور میرے اندر پیدا ہوا۔ میں نے ایسا محسوس کیا جیسے شب و روز کا نہ ختم ہونے والا سفر ختم ہو گیا، اور اب ہم ساحل مقصود سے آ لگے ہیں۔

میں فشن سے اتری اور خاموشی کے ساتھ اپنے سیاہ فام رہنما کے قدم بہ قدم چلنے لگی، ذرا دور چلنے کے بعد ایک بہت اونچی اور دودھ کی طرح سفید دیوار نظر آئی، سامنے ایک بہت بڑا آہنی پھاٹک تھا، یہاں آ کر ہم رک گئے ہمارے ساتھی نے زور سے پھاٹک کھٹکھٹایا، پھر اندر سے آواز آئی،

"کون ہے؟"

میرے ساتھی نے ایک ہی سانس میں آتنی ہی بلند آواز سے جواب دیا۔
"میں ہوں سلطان والاشان کے چیف خواجہ سرا کسلر آغا کا مددگار!"
فوراً پھاٹک کھل گیا، دروازہ کھولنے والا بھی ویسا ہی سیاہ رو اور بدہیئت تھا جیسا میرا یہ ناخدا جو مجھے اسکودر سے خرید کر یہاں لایا تھا،

اس پھاٹک سے آگے بڑھ کر ایک دوسرے پھاٹک سے ہمیں گزرنا پڑا۔
پیادہ روی کے درمیان میں مختلف عمارتوں کی طرف اشارہ کر کر کے ہمارا یہ خواجہ سرا ان کے نام سے ہمیں آشنا کرتا جاتا تھا۔

"یہ دیکھئے یہ خزانۂ عامرہ ہے!"

"اور ہاں یہ عمارت جو نظر آرہی ہے، یہ کتب خانہ ہے!"

"اور یہ ——— مطبخ ہے!"

ان عمارتوں سے گزرتے ہوئے ہم حرم سرا کے صدر دروازہ پر پہنچے، یہاں مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔
یہاں پہنچنے کے بعد مردوں کی عملداری ختم ہو گئی!
میں ایک عورت کے حوالہ کر دی گئی، جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ میرے سامان آرائش اور راحت و آسائش کی یہ ذمہ دار ہوگی،

---

(۹)

آرائش

یہاں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے مجھے حمام میں لیجایا گیا، حمام میں جیسا صاف شفاف اور خوشبودار پانی نظر آیا، یہ میرے لئے بالکل نئی چیز تھی، میری خوشی حد بیان سے باہر تھی،

اس پانی سے خوب سیر ہو کر میں نہائی، نہایت اعلیٰ درجے کے قیمتی جوڑے پہلے ہی پہنچا دیئے گئے تھے، چنانچہ غسل سے فارغ ہوتے ہی میں نے یہ نیا لباس بھی پہن لیا میرے بال جو اس مسلسل سفر کے باعث چکٹ ہو رہے تھے، مختلف قسم کی چیزوں سے دھوئے گئے، پھر انہیں برش کیا گیا، اس کے بعد کنگھی کی باری آئی

یہ سارے کام، اس پھرتی، خوبصورتی اور لطف کے ساتھ انجام دیئے گئے، کہ میں ایک قسم کی لذت سی محسوس کرنے لگی اس غسل نے مجھے ہلکا پھلکا بنا دیا تھا، گذشتہ ایام کے آفات و مصائب کے تواتر اور تسلسل نے مجھے خستہ اور درماندہ کر دیا تھا لیکن قصر یلدیز کے اس مختصر سے قیام نے مجھے بالکل نئی دُنیا میں پہنچا دیا

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں جہنم سے نکال کر فردوس بریں میں پہنچا دی گئی ہوں۔

جو عورت میری خدمت پر مامور کی گئی تھی، اس نے مجھے بتایا،

"آپ کو بہت جلد والدۂ سلطان ذی شان کی خدمت میں باریاب ہونے کی عزت عطا کی جائے گی!"

میں اپنا استعجاب نہ چھپا سکی، میں نے پوچھا،

"یہ کون صاحبہ ہیں؟"

وہ ہنستی ہوئی گویا ہوئی،

یہ ہمارے سلطان معظم کی والدۂ محترمہ ہیں، ساری حرم سرائے قصر سلطانی، اور محلسرا میں بس انہی کی حکومت ہے، کسی کی مجال نہیں کہ ان سے سرتابی کر سکے یا آنکھ اُٹھا کر ان سے بات کر سکے۔

خادمہ نے میرے بالوں کی آرائش سے فراغت کر کے اپنے ہاتھ سے مجھے بیش قیمت کپڑے پہنائے پھر حرم سرا کے اس حصہ میں لائی جو میرے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ میں اس کمرہ میں لائی گئی، جو میری خواب گاہ بننے والا تھا، یہاں پہنچ کر تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اتنا عالی شان ساز و سامان میری نظر سے کبھی اور کہیں نہیں گذرا تھا، واقعی یہاں کے ٹھاٹھ، بادشاہوں کی رہائش گاہ کے سے تھے،

ایک طرف یہاں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی جگمگاہٹ تھی، شان تھی، وقار و تمکنت تھی، جاہ و تجمل تھا، دوسری طرف ایسے آداب و تکلفات تھے، جن کے ہم جار جیا کے رہنے والے آزاد منش لوگ نہ عادی تھے نہ واقف تھے عجیب ملی جلی سی کیفیت مجھ پر طاری تھی، حیرت بھی، مسرت بھی، غم بھی خوشی بھی، اضطراب بھی اطمینان بھی۔

یک بیک میرے خیالات کی رو عہد ماضی کی طرف لپٹی، مجھے وہ دن یاد

آگیا جب میرے اضمحلال اور افسردگی کو دیکھ کر والدہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چند روز کے لئے مجھے اپنی بہن کے سسرال میں جاکر رہ آنا چاہیئے،

پھر مجھے وہ وقت یاد آیا، جب والدہ یدیزا اور میں پورے انہماک کے ساتھ سامانِ سفر تیار کرنے میں مشغول تھے، میں خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی، کچھ سفر کا شوق، کچھ بچھڑی ہوئی بہن سے ملنے کا اشتیاق، کچھ نئے ماحول اور نئی فضا میں پہنچنے کی دُھن ——— اور ٹھیک اسی حالت میں قسمت نے بازی پلٹ دی، رہزنوں کا ایک مضبوط گروہ، ہم پر ٹوٹ پڑا، اس نے بے دردی سے ہمارے آدمیوں کو قتل کیا، شاندار حویلی کو خرابہ بنادیا، اس وحشت کے عالم میں والدہ کی حرکتِ قلب بند ہو گئی، مجھے اور میری وفادار یدیزہ کو گرفتار کر لیا گیا ہماری خوشی خاک میں مل گئی، فلک کج رفتار سے ہماری یہ نامعلوم خوشی نہ دیکھی گئی، میں کشاں کشاں اپنی حویلی سے گرفتار کرکے باہر نکالی گئی، اور ایک نئی ——— بالکل نئی اور عجیب دنیا میں پہنچ گئی ——— رہ رہ کر میرے دل میں ٹیس اٹھتی، اور گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگتا،

میں ایک معزز قبیلہ کے سردار کی بیٹی تھی، ساری زندگی ——— جس کی مدت صرف ۱۹ سال تھی ——— عیش و راحت، میں بسر ہوئی تھی، لیکن یہاں آکر اپنی امارت، غربت سے بدتر نظر آنے لگی ——— پھر بھی کتنا فرق تھا دونوں حالتوں میں!

وہاں ——— میں آزاد تھی، خود مختار تھی، عزت میری بلائیں لیتی تھی، کون تھا جو مجھے دیکھتا اور احترام سے سر نہ جھکا لیتا سارے قبیلہ پر میرے خاندان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی،

یہاں ——— میں باندی تھی،

میرے اعصاب پر اس تخیل نے بڑا گہرا اثر کیا - اور میں ماندگی سی محسوس کرنے لگی ——————— ذہنی بوجھ جو مجھ پر قابو پاتا چلا جا رہا تھا -

---

(۱۰)

میرا رکھ رکھاؤ

میری زندگی کا طور طریقہ بالکل شاہانہ صورت اختیار کرتا جا رہا تھا، بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ زرکار و زرنگار ملبوسات کا ایک ڈھیر میرے سامنے لگا رہتا، ان میں ایسے کپڑے بھی تھے جو میرے وطن جار جیا کے فیشن کے مطابق تھے، انہیں میں اب بھی بڑے شوق اور چاؤ سے پہنا کرتی تھی،

عام طور پر میرا لباس دو قسم کی پوششوں سے مرتب تھا، ریشم کا بنا ہوا، سفید رنگ کا ایک زیر جامہ، پھر اون کی بنی ہوئی قمیص، اس کے اوپر ایک صدری اس صدری پر طرح طرح کے کام بنے ہوئے تھے۔ جس سے اس کی خوش نمائی اور دیدہ زیبی بہت بڑھ گئی تھی، جس کی لمبی لمبی آستینیں پہنچوں تک چلی آتی تھیں،

لباس جب میں پہن چکتی تو خادمہ ایک لمبی سی شال میری کمر کے گرد لپیٹ دیتی، جس کے دامن میرے گھٹنوں تک گرتے تھے۔

میری سلیپر کا رنگ لال تھا، اس میں ایڑی نہیں تھی، اور سامنے کی طرف

ایک نکیلی سونڈ سی اُٹھی ہوئی تھی،

میرے سر کا لباس یہ تھا،

نیلے رنگ کی ایک ریشمی ٹوپی، اس پر ایک پھندنا جو پیچھے کی طرف لٹکتا رہتا تھا،

پہلے پہل یہ لباس اور یہ تکلفات مجھے بہت نامانوس اور نامرغوب محسوس ہوئے، ایسا لباس اگر ہم جارجیا کے رہنے والے پہننے کے خوگر ہوتے تو گھوڑے سواری کو کسی طرح کر ہی نہیں سکتے تھے، اور وہ ٹھہری ہماری بابی،

لیکن جلد ہی اپنی حماقت پر مجھے افسوس آنے لگتا،!

اب ان باتوں کی یاد سے حاصل کیا تھا، سوائے غم و الم اور اندوہ و تعب کے کہاں جارجیا کا وہ کوہستانی اور میدانی علاقہ جہاں آزادی تھی، زندگی تھی، خوشی تھی، کہاں قسطنطنیہ کا یہ فلک شکوہ محل جہاں پابندی ہے، غلامی ہے، بے اختیاری ہے،

مجھے جو لباس دیا گیا تھا، وہ محلسرا کی عام باندیوں سے کہیں الگ، اور بہت زیادہ ممتاز تھا،

خادمہ کا رویہ بھی میرے ساتھ عزت و احترام کا تھا، وہ میرے سامنے زور سے نہیں بول سکتی تھی، ادب و لحاظ اس کا شیوہ تھا، آنکھیں جھکائے رہتی جو کچھ میں دریافت کرتی، بس اس کا مختصر سا جواب دے کر پھر خاموش ہو جاتی،

ایک دشواری بے شک بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی، اور میرے لئے کافی دردِ سر کا سبب بن گئی تھی، میں ترکی زبان نہ جاننے کے برابر جانتی تھی، یہاں کی باندیاں اور خادمائیں ہماری جارجیا کی زبان سے ناواقف تھیں، انہیں اپنا مطلب سمجھانے میں، یا ان کا مطلب سمجھنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا

تھا - زیادہ تر ہم لوگ اشاروں سے باتیں کرتے، یا پھر ایسی حرکتیں جن سے ہمارا مطلب سمجھنا دوسروں کے لئے کسی حد تک آسان ہوجاتا۔ ——— میں نے طے کر لیا کہ مجھے جلد از جلد ترکی زبان سیکھ لینی چاہیئے۔

جب میں یہ دیکھتی کہ محلسرا میں میرے ساتھ جو برتاؤ ہوتا ہے، وہ دوسری باندیوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہے، تو خوشی کی ایک غیر شعوری کیفیت مجھ پر طاری ہوجاتی، میرا لباس، میرا رہن سہن، میرا کھانا، میرا ناشتہ، ہر چیز دوسروں سے الگ اور ممتاز تھی، اس برتاؤ نے میرے دل میں یہ احساس پیدا کر دیا تھا، کہ میں دوسروں سے بہرحال فائق ہوں، مجھ سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا، اس کے برعکس دوسری باندیوں کو کافی محنت مشقت کا کام باقاعدگی کے ساتھ انجام دینا پڑتا تھا، اس طرز عمل سے میرے اس جذبۂ برتری کو بھی آسودگی ملتی تھی جو ہر جارجین عورت کے حصّہ میں قدرت کی طرف سے ودلیعت ہوتی ہے، نسل اور نسب کے اعتبار سے جارجیا کی رہنے والی عورتیں کسی کو اپنا مقابل نہیں سمجھتیں، ——— میں بھی اس جذبہ سے خالی نہ تھی، یہ دوسری بات ہے کہ اب تک میں نے اپنے احساس برتری کو دوسری عورتوں پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا،

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں آرام سے ایک صوفہ پر بیٹھی ہوئی تھی، کہ ایک باندی آئی اس نے ایک نقاب میرے چہرے پر ڈال دیا، اس سے میری ناک اور چہرے کا نچلا حصّہ چھپ گیا، نقاب کو دو ہلکی ڈوریوں سے میرے دونوں کانوں کے اطراف میں باندھ دیا گیا تھا، البتہ میری آنکھیں بالکل کھلی تھیں -

وطن میں گھر پر میں نے کبھی خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں سوچی تھی کہ مجھے کبھی زیر نقاب آنا پڑے گا، لیکن یہاں قصر شاہی میں ہر عورت کے لئے نقاب پہننا لازمی تھا، مجھے گو یہ چیز سخت ناپسند تھی، لیکن میں بھی اس سے بچ نہ سکی،

باندی سے میں نے دریافت کیا۔ تم اسے کیا کہتی ہو؟

وہ کہنے لگی ہماری زبان میں ایسے شمک کہتے ہیں،

پھر اس نے نقاب استعمال کرنے کے ایک دوسرے طریقہ کی مجھے تعلیم دی ایک ٹکڑا نقاب کا سر پر باندھ لیتے تھے، بھوؤں کے پاس سے باندھ کر اس کی ڈوری گردن تک لے آتے تھے، پھر دوسرا حصہ ناک سے شروع ہو کر ٹھوڑی پر ختم ہو جاتا تھا، یہ طریقہ پہلے سے زیادہ خوبصورت تھا، اس طرح سانس لینے میں بھی آسانی ہوتی تھی، اس طرح سے بند نقاب کرنے میں چہرہ چھپے نہیں پاتا تھا بلکہ ایک پر اسرار قسم کا ہلکا سا حجاب جو نظروں کو اور زیادہ اپنی طرف کھینچتا تھا حائل ہو جاتا تھا، اس طرح بدصورت چہرہ بھی نقاب کی باریک جھلملی سے خوبصورت نظر آنے لگتا تھا،

عام لباسوں کے علاوہ مجھے البا کا سیاہ رنگ کا ایک لباس بھی دیا گیا، مجھے ہدایت دی گئی کہ یہ لباس صرف البستان سرائے باہر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

میری قسمت اب تک غیر متعین تھی، اس اہتمام، خاطر داشت، اور جاہ و احتشام کے باوجود میں نہیں سمجھ سکتی تھی کہ میری واقعی اور اصل پوزیشن کیا ہے: آیا میں بدستور ایک قیدی ہوں، یا اس زندگی میں میرا کوئی حصہ ہے، اور اس حصہ سے میں بہرہ ور ہو سکتی ہوں؛ بلند بالا دیواروں کے

(۱۱)

والدۂ سلطان کے سامنے

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں اطمینان سے بیٹھی تھی کہ باندی نے آکر مجھے زیرِ نقاب کر دیا جس سے میری اُلجھن اور زیادہ بڑھ گئی، مجھے اس طرح تماشہ بنا چکنے کے بعد اس باندی نے میرا جائزہ لینا شروع کیا، کبھی آگے بڑھ کر میرا نظارہ کرتی، کبھی دو قدم پیچھے ہٹ جاتی، اور مجھے دیکھنے لگتی، سر سے لے کر پاؤں تک میری ہر ہر چیز کو وہ اس طرح دیکھ رہی تھی، جیسے میں اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا، ایک کھلونا ہوں جسے نمائش میں رکھنے سے پہلے وہ ہر طرح اپنا اطمینان کر لینا چاہتی ہے کہ کسی طرح کا نقص تو نہیں رہ گیا، کوئی کمی تو نہیں ہے؛

اسی اثناء میں وہ خواجہ سرا جو مجھے خرید کر لایا تھا، میرے کمرہ میں داخل ہوا، اس نے مجھ سے کوئی بات چیت نہیں کی، البتہ میری خادمہ سے سرگوشی کے انداز میں باتیں کرنے لگا، پھر میں نے ایسا محسوس کیا جیسے دونوں نے ایک دوسرے سے کسی بات پر اتفاق کر لیا، میں نے ان دونوں کی باتوں اور سرگوشیوں سے کوئی دلچسپی نہیں لی، خواجہ سرا نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا، خادمہ نے کہا،

حصار میں اب تک میں گھری ہوئی تھی، نہ پر پرواز تھے، نہ طاقتِ پروا
—— صرف حسرت اور اُمید یا بس۔

"جاتے ہے، اس کے ساتھ ذرا تشریف لے چلیئے!"

مجھے اس فرمائش کی تعمیل میں تامل کیوں ہوتا، اپنی حیثیت اور
کو میں اچھی طرح محسوس کر رہی تھی، بغیر کسی حیل وحجت کے میں اٹھی اور اس کے
ساتھ ہو لی۔

ہم مختلف قطعات سے گزرتے ہوئے، ایک ایسی عمارت میں پہنچے
خاصی وسیع اور کشادہ تھی،

سامنے ایک دروازہ تھا اور اس دروازے پر خوبصورت مخمل کا پردہ
ہلا تھا، خواجہ سرائے، پردہ کے پاس جاکر آواز لگائی،

"والدہ سلطان ——— "

اس لفظ میں نہ جانے کیسا جادو اور کیا تاثیر تھی کہ دہشت سے اس
کا کالا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، اس کی آواز میں ارتعاش سا تھا، وہ کانپ رہا
ظاہر ہے اس کی وجہ دہشت ہی تھی۔

دو باندیاں آگے بڑھیں، انہوں نے مخمل کے اس پردے کو خاموشی کے
ساتھ ہٹایا،

پردہ ہٹتے ہی ایک عجیب منظر نظر آیا، ایک تخت مصفا پر سلطان
ذی شان کی والدہ محترمہ لیٹی ہوئی تھیں، اس تخت، اس کی مسند، تکیہ اور دوسرے
ساز وسامان کی گراں مائگی کو بیان کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لائے جائیں
ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے الف لیلے کے افسانوی محل میں ہم پہنچے ہوئے ہیں، اور یہ
عجیب وغریب منظر دیکھ رہے ہیں، آس پاس خواصیں اور خادمائیں مودب حکم کی
منتظر کھڑی تھیں، بعض ان میں سے مورچھل ہلا رہی تھیں، بعض احکام وہدایات
کی منتظر کھڑی تھیں، لیکن خاموش، جیسے بت!

یہ تھیں سلطان والاشان کی والدۂ محترمہ!

یہ تھا سلطان ذی شان کی والدہ محترمہ کا دبدبہ اور طنطنہ!

خواجہ سرا مجھے لے کر آگے بڑھا دو رویہ جو باندیاں کھڑی ہوئی تھیں، انہوں نے مجھے راستہ دیا اور میں جاکر والدۂ سلطان کے بالکل سامنے کھڑی ہو گئی،

یہ ادھیڑ عمر کی ایک باوقار اور بارعب خاتون تھیں، ان کے بدن پر جو لباس تھا، اور جو زیورات یہ پہنے ہوئی تھیں جس جاہ و جلال کے ساتھ یہ اس وقت نشست فرما تھیں، ان سب باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ واقعی یہ بہت بڑی اور بااقتدار شخصیت کی مالک ہیں۔

سامنے ایک تپائی پر سونے اور چاندی کی رکابیاں رکھی تھیں، جن میں مٹھائی کی مختلف قسمیں رکھی ہوئی تھیں، دو باندیاں آہستہ آہستہ مورچھل ہلا رہی تھیں ایک پستہ قد اور بدہیئت شخص جسے بالشتیا کہنا زیادہ موزوں ہوگا، طرح طرح کے کرتب دکھا رہا تھا، لیکن لوگ اس کی ان حرکتوں کے اتنے عادی ہو چکے تھے، کہ اب کوئی اس سے دلچسپی نہیں لیتا تھا۔

والدۂ سلطان نے اشارہ سے مجھے اپنی طرف بلایا، ساتھ ہی ساتھ ایک باندی کو بھی اشارہ کیا جس کے سُرخ بال اور نیلی آنکھیں اس امر کی غماضی کر رہی تھیں کہ یہ بھی میری ہم وطن یعنی جارجیا کی رہنے والی ہے، اس باندی نے اپنی مالکہ کا اشارہ پاکر تابڑ توڑ مجھ سے کئی سوال کر ڈالے،

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"تمہاری عمر کیا ہو گی؟"

"تمہارے والد کا نام کیا تھا؟"

"تم کس قبیلے سے تعلق رکھتی ہو؟"

"گھر پر تمہارا مشغلہ کیا تھا؟"

"تمہارے بھائی بہنوں کی تعداد کیا ہے؟"

"تمہاری والدہ زندہ ہیں یا مر گئی ہیں؟"

یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات اس باندی نے مجھ سے کئے۔

اتنے دنوں کے بعد جب پہلی مرتبہ میں نے اپنی مادری زبان سنی تو کہہ نہیں سکتی کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی؟

اس باندی کو دیکھ کر اپنی پیاری زبان میں اس کی بات سن کر بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں اس سے لپٹ جاؤں لیکن فضا اتنی خاموش اور منظر اتنا بارعب تھا کہ وہ باندی اپنی مالکہ سے ادب و احترام کے ساتھ گردن جھکائے باتیں کر رہی تھی وہ اسے بار بار علیا حضرت کہہ کر مخاطب کرتی تھی، میں ایک بت کی طرح خاموش کھڑی تھی، جو لوگ یہاں موجود تھے وہ اتنے مؤدب نظر آ رہے تھے کہ مجال نہیں تھی، ذرا بلند آواز سے گفتگو کر سکیں، یا ایک دوسرے سے آنکھ ملا سکیں میں خود بھی دہشت زدہ کھڑی تھی، اور میری آنکھیں جھکی ہوئی تھیں،

والدہ سلطان کی ہدایت کے مطابق ایک باندی آگے بڑھی اور اس نے نقاب میرے منہ سے ہٹا لیا، میری ہم وطن باندی نے مجھے مبارک باد دیتے ہوئے کہا علیا حضرت ارشاد فرماتی ہیں "یہ لڑکی واقعی بڑی خوبصورت ہے، وہ اس حبشی خواجہ سرا سے بھی بہت خوش ہیں جو تمہیں منتخب کر کے یہاں لایا ہے علیا حضرت یہ بھی فرماتی ہیں کہ انہیں حیرت ہے کہ تمہارے وطن کی لڑکیاں ترک دوشیزاؤں کے مقابلہ میں اتنی زیادہ خوبصورت اور سحر طراز کیوں ہوتی ہیں؟ شاید اس لئے کہ ان کا ناک نقشہ زیادہ چوکھا نہیں ہوتا، بہت جلد وہ موٹی اور بھدی ہو جاتی ہیں۔

والدۂ سلطان کے یہ ارشادات میں نے سر جھکا کر سنے، اس کے بعد ہماری غذا کے بارے میں کچھ پوچھ گچھ ہوئی۔ پھر مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کس کام سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہوں؛ میں نے بتایا کشیدہ کاری میرا محبوب مشغلہ ہے، اس کے بعد مجھے والدۂ سلطان کی اس پیش خدمت سے وابستہ کر دیا گیا، جو ملبوسات شاہی کی منتظم تھی۔

اس کے بعد والدۂ سلطان نے زبان سے کچھ کہے بغیر اپنے ہاتھ کو جنبش دی جس کا مطلب یہ تھا کہ میں اب جا سکتی ہوں۔

---

(۱۲)

میری پیاری عزیزی

میرے اور عزیزی کے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے۔ عزیزی اس باندی کا نام تھا جو جارجیا کی رہنے والی تھی اور والدۂ سلطان کی پیش خدمتوں میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی تھی، میری رفاقت اور صحبت سے وہ بھی اتنی ہی مسرور اور شاداں ہوئی تھی، جتنی میں اس کی رفاقت و صحبت سے ! — ہم دونوں اس بات سے بہت خوش تھے کہ ایک ہی آقا کی خدمت میں ہمیں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ والدۂ سلطان کے محل میں تین محکمے تھے،

(۱) باورچی خانہ

(۲) جامہ خانہ

(۳) آرائش خانہ

ان تینوں کی انچارج الگ الگ عورتیں تھیں، ہم لوگ جامہ خانہ سے متعلق تھے ہم دونوں ایک دوسرے کو اس کے اصلی نام سے پکارتے تھے، میں اسے عزیزی کے نام سے یاد کرتی تھی، وہ میرا نام نشاط لیتی تھی۔ آج بھی ہم دونوں بیٹھے آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے، اتنے میں مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اور ہم وہاں جانے

کی تیاری کرنے لگے۔ میرا دل شکرِ خداوندی سے لبریز تھا، میں بار بار اپنے پروردگار کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اتنی تباہیوں اور بربادیوں کے بعد، گھر سے نکلنے، بازار میں بکنے اور نئے شہر میں آنے کے باوجود میری عزت آبرو قائم تھی۔

عزیزی بڑی خوبصورت اور طرحدار لڑکی تھی۔ تقریباً دو سال ہوئے یہ بھی اسی طرح رہزنوں کے ہاتھ آگئی، جن حالات سے مجھے دوچار ہونا پڑا تھا، اس کا قبیلہ میرے قبیلے سے کوئی دس بارہ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اب اتنے دنوں کے بعد سوچتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر عزیزی کی رفاقت مجھے میسر نہ آتی تو میں کیا کرتی؟ کیونکہ ترکی زبان سے نا آشنا تھی اور میری زبان کو کوئی جانتا نہ تھا۔ ترکی زبان کی تعلیم دینے کے لئے باقاعدہ استانی مقرر تھی۔ میں اس سے روز سبق لیتی تھی، لیکن میری تحصیل کی رفتار بہت سست تھی۔

عزیزی نے اس محل کی ایک ایک چیز مجھے دکھا دی۔ باندیوں کے رہنے کے کمرے، دالان، باغیچے، عجائب گھر، کتب خانہ، ہر چیز محل کے اس قطعہ میں جہاں میں رہتی تھی۔ تقریباً سولہ لڑکیاں ہماری طرح کنیزی کی زندگی بسر کر رہی تھیں، ہم سب لوگ اپنا کام محنت اور مستعدی سے کرتے تھے، فرصت کے اوقات گپ شپ میں اس طرح بسر ہو جاتے، کہ پتہ بھی نہ چلتا تھا۔

اس محل کے اندر متعدد کوشک تھے، یہ سب بڑے خوبصورت اور ہر طرح کے ضروری ساز و سامان سے آراستہ تھے، ان کی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں، جب طبیعت زیادہ گھبراتی تو ان کھڑکیوں کے پاس جا کر ہم کھڑے ہو جاتے اور باہر کا نظارہ کرنے لگتے۔ یہ نظارہ اتنا دلکش ہوتا کہ اس میں کھو کر رہ جاتے۔ کوشکوں کے ارد گرد بلند و بالا درختوں کے جھنڈ کھڑے ہوئے تھے۔ جن سے ان کی دلآویزی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ سامنے ایک وسیع لان تھا۔ جس کے دونوں طرف بڑے بڑے درختوں کی

قطاریں تھیں۔ بیچ میں فوارے تھے۔ جن سے مختلف صورتیں اختیار کرتا ہوا پانی اُبل رہا تھا، فصیل میں جو دروازہ لگا تھا، اس کے کھلنے کے بعد جو نظارہ نظر آتا وہ اتنا دلکش اور دلآویز ہوتا تھا کہ یہ معلوم ہوتا ہم پرستان میں پہنچ گئے ہیں۔ فوارے کا پانی چھوٹی چھوٹی نہروں میں جاتا اور وہاں سے ناچتا، کودتا، چمکتا، ابھرتا اور بل کھاتا بحیرۂ مارمورا میں جا گرتا۔ یہ اتنا دلکش اور نظر افروز منظر تھا کہ میرا خیال ہے کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

ایک مرتبہ اسی طرح میں کھڑی اس نظارے میں کھوئی ہوئی تھی اور اسے بالکل بھول چکی تھی کہ میری حیثیت کیا ہے؟ اور سچ پوچھو تو میری حیثیت تھی بھی مشتبہ، اس لئے کہ نہ میں باندی تھی، نہ آزاد، باندی اس لئے نہیں کہ میری آنکھوں کے سامنے بہت سی باندیاں تھیں اور ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا تھا وہ میرے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ آزاد اس لئے نہیں تھی کہ اپنی مرضی اور ارادے پر مجھے کوئی اختیار نہیں تھا۔ اتنے میں عزیزی میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کے آتے ہی میرے خواب شیریں کا سلسلہ منقطع ہو گیا، میں نے اس سے کہا۔

"خوبصورت، نظر فریب، روح پرور، عزیزی دیکھتی ہو کتنا دلچسپ منظر ہے یہ!"

عزیزی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

"ہاں تم سچ کہتی ہو، لیکن کیا یہاں بھی جارجیا کی وہ پہاڑیاں نظر آتی ہیں جن کی گود میں ہم پروان چڑھے تھے؟ ——— وہ گھر کہاں؟ وہ لوگ کہاں؟ وہ فضا کہاں؟ نشاط! یہاں سب کچھ ہے مگر وہ نہیں جس کے لئے ہم تڑپتے رہتے ہیں۔"

ہماری آنکھیں ملیں اور بے اختیار ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے بڑی دیر تک یاد ماضی میں کھوئے رہنے کے بعد آہستہ آہستہ ہمارے قدم حرم سرا کی

طرف اٹھنے لگے۔

دن آہستہ آہستہ گذرتے رہے۔

عمارتوں کا یہ مجموعہ جہاں ہم رہ رہے تھے بجائے خود ایک شہر تھا، میں ایسے مکانوں اور ایسی فضا میں رہنے کی عادی نہ تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر طرح کے آرام و آسائش کے باوجود گھلتی چلی جارہی تھی۔

ایک روز عزیزی مجھے لے کر چھت پر چڑھی اور اشارے کر کر کے مختلف عمارتوں کا تعارف کرانے لگی۔

"دیکھنا نشاط! یہ عمارت جو نظر آرہی ہے یہ خزانہ عامرہ ہے۔

اور وہ سامنے خوبصورت سی عمارت جو دکھائی دیتی ہے یہ سلطان کا راحت کدہ ہے!

وہ مینار جو نظر آرہے ہیں شاہی مسجد کے ہیں!

وہ دھندلی سی بلند تنگ خواب گاہِ سلطانی ہے!

یہ کوارٹروں کا جو سلسلہ نظر آرہا ہے، یہاں سفید فام خواجہ سرا رہتے ہیں!

وہ شاہی اصطبل ہے!

وہ کوارٹروں کی دوسری قطار غلاموں کی اقامت گاہ ہے!

وہ داہنی طرف دیوان کا ہال ہے!

دیکھنا! وہ والدہ سلطان کا شبستان عیش ہے!

والدہ سلطان کا نام سن کر میری آنکھوں کے سامنے اس باوقار اور بارعب خاتون کی تصویر پھر گئی۔ جو محل سرائے سلطانی میں سب سے زیادہ با اقتدار اور با اختیار ہستی تھیں۔ حرم سرا کا ذرہ ذرہ ان کے نام سے

کانپتا تھا۔ اس محل کے اندر، اس نے اپنی مستقل حکومت قائم کر رکھی تھی، اس کا الگ خزانہ تھا۔ الگ وزیر، خزانچی، خواجہ سرا، غلام، باندیاں ہر چیز جداگانہ اور الگ ہے۔ اس کا ڈرائنگ روم، حمام، خلوت گاہ، ایوان دربار، بالکل الگ ہے ـــــ اس جاہ و تجمل کی کوئی عورت میری نظر سے نہیں گذری تھی! ـــــــ

(۱۳)

والدہ سُلطان

اب تک سلطان والاشان کے دیدار سے مشرف ہونے کا موقع مجھے نہیں ملا تھا، عزیزی سے ان کے بارے میں میں نے جو کچھ سنا تھا، اس کی بنا پر میں نے یہ رائے قائم کی تھی، کہ وہ ایسی ہستی ہے جس سے ہر شخص لرزاں اور ترساں رہتا ہے، عزیزی سے میں نے کہا۔

"کیا سلطان کی زیارت سے مشرف ہونے کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی؟ میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ انہیں دیکھوں؟"

عزیزی نے مجھے بتایا۔

"امروز فردا میں سلطان والاشان عساکر شاہی کا معائنہ کرنے برآمد ہوں گے۔ وہ وقت ہوگا جب جلال و جمال کی پوری شان کے ساتھ تم ان کا نظارہ کر سکو گی۔"

رات کو جب ہم سونے کے لئے اپنی خواب گاہ میں پہنچتے تو بڑی دیر تک مجھ میں اور عزیزی میں سرگوشیاں ہوا کرتیں، وہی وطن کی یاد، وہاں کی پہاڑیوں، میدانوں اور وادیوں کا ذکر، باتوں باتوں میں آپ بیتیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا۔ زندگی کے

خوشگوار اور غم انگیز حوادث کی داستان کبھی وہ شروع کر دیتی تھی ہیں۔

والدۂ سلطان کی خدمت میں بھی حاضری کے زیادہ مواقع ہمیں نہیں حاصل تھے ہفتے میں صرف ایک بار ان کی پیشی میں ہمیں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ اب تک ہماری حیثیت صرف امیدوار کی تھی، مستقل طور پر ہماری کوئی حیثیت نہیں متعین ہوئی تھی۔ ہم والدۂ سلطان کی خدمت میں ہفتہ کے ہفتہ اپنی استانیوں کے ساتھ حاضر ہوتے۔ وہ ہمارا امتحان لے کر اندازہ کر لیتیں کہ پچھلے ہفتہ کے مقابلہ میں ہم نے کتنی ترقی کی ہے۔

حاضری کے ہر موقع پر ہم آہستہ آہستہ ان کے سامنے جاتے، اپنے ہونٹوں اور پیشانی کو دو انگلیوں سے چھو کر سلام کرتے، پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ نظر اٹھا کر بھی ہمیں نہ دیکھتیں، کبھی ایک نگاہِ غلط انداز ڈال لیتیں، لیکن عزیزی نے مجھے بتا رکھا تھا کہ والدۂ سلطان ہماری طرف دیکھیں یا نہ دیکھیں ہمیں پوری باقاعدگی کے ساتھ تمام آداب و تکلفات کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلام کا فریضہ بجا لانا چاہیے۔ اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو وہ ضرور محسوس کریں گی۔ اور پھر خیریت نہیں۔

ایک روز ہم والدۂ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے سامنے قیمتی پتھروں اور سونے چاندی کی بنی ہوئی طشتریوں میں طرح طرح کے پھل، میوے اور مٹھائیاں رکھی تھیں۔ دوبارہ جب ہم گئے تو ہم نے دیکھا آج سماں بالکل بدلا ہوا ہے۔ وہی بالشتیہ طرح طرح کے کرتب دکھا رہا ہے۔ اور اتنے زور زور سے ہنس رہا ہے کہ کوئی دوسرا ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا، ایک مرتبہ اور جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ سارا کمرہ نئی نئی اور عجیب عجیب خوشبوؤں سے بس رہا ہے محل سرا میں نہایت اعلیٰ درجے کے عطر تیار کرنے کا کارخانہ بھی قائم تھا۔

والدۂ سلطان کے کمرہ میں نہایت دبیز اور خوبصورت قالین سارے

فرش پر بچھے ہوئے تھے۔ ایک طرف مسند بچھی تھی اور گاؤ تکیہ لگا تھا۔ دوسری طرف ایک تخت تھا اور اس پر زرنگار چادر لٹک رہی تھی۔ دروازے پر اور کھڑکیوں پر رنگارنگ کے پردے لٹک رہے تھے۔

والدۂ سلطان کی عمر کچھ بہت زیادہ نہ تھی، اگرچہ ان کے بال سفید ہو چکے تھے۔ لیکن انہیں حنا کے رنگ میں اس خوبی سے رنگا تھا کہ بجائے بدنما معلوم ہونے کے بہت زیادہ خوبصورت نظر آتے تھے۔ ان کی لمبی لمبی سیاہ آنکھوں میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جادو بھرا ہے۔ غازہ کے استعمال نے چہرہ کا نکھار بڑھا دیا تھا۔ اگر کسی کو ان کی عمر نہ معلوم ہوتی تو حرم سرا کی دوشیزاؤں میں وہ بڑی آسانی سے گھل مل سکتی تھیں۔ وہ بہت زیادہ خود بیں اور خود نما تھیں، ان کے سامنے تپائی پر ایک خوبصورت اور بڑا سا آئینہ ہر وقت رکھا رہتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بڑی پابندی سے وہ اپنے چہرۂ زیبا کا دیدار کیا کرتی تھیں، اگر ذرا بھی انہیں اپنے لبوں اور چہرہ میں کوئی خامی نظر آتی تو وہ حبشی خدمت جس کا کام آرائش کرنا تھا فوراً طلب کر لی جاتی، اس کے آتے ہی والدہ کے اردگرد ایک پارٹیشن کھڑا کر دیا جاتا اور وہ عورت چند لمحوں کے اندر انہیں پھر اتنا ہی دیدہ زیب بنا دیتی جیسا وہ چاہتی تھیں۔

والدۂ سلطان کو ہماری رفتار ترقی سے بڑی دلچسپی تھی اور میں تو ایسا محسوس کرتی تھی جیسے مجھ پر وہ خاص طور پر مہربان ہیں۔ ہم میں سے ہر عورت کسی نہ کسی حد تک ترکی زبان بول لیتی تھی۔ والدۂ سلطان کے سامنے ہمیں ترکی زبان میں بات کرنی پڑتی تھی۔ تاکہ وہ اندازہ کر لیں ہم نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ وہ بڑی ذہین عورت تھیں، ہماری کسی غلطی سے وہ فوراً اندازہ لگا لیتیں کہ یہ غلطی غفلت کا نتیجہ ہے یا گھبراہٹ کا۔ میری گفتگو سننے کے بعد بڑے پیار بھرے لہجہ میں وہ فرماتیں،

"شاباش! بہت اچھی جا رہی ہو۔"

والدہ سلطان کی یہ حوصلہ افزائی مجھ میں ایک نئی امنگ پیدا کر دیتی، انہیں خوش رکھنے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ مجھے مجبور کرتا کہ زیادہ سے زیادہ اچھے طور پر کم سے کم مدت میں ترکی زبان حاصل کر لوں، پوری محنت اور مستعدی کے ساتھ میں ترکی زبان کی تحصیل میں لگی ہوئی تھی، تاکہ ان کی خوشنودیٔ مزاج قائم رہے۔ اور میرے بارے میں انہوں نے جو رائے قائم کر لی ہے، اس میں فرق نہ آئے۔

والدۂ سلطان کو کاجل بہت پسند تھا۔ وہ خود بھی اس کا استعمال پابندی سے کرتی تھیں، اور چونکہ مجھ سے زیادہ خوش تھیں، اس لئے مجھے بھی ہدایت کرتی رہتی تھیں کہ کاجل لگاتی رہوں، ان کا خیال تھا اس طرح آنکھوں کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ کاجل لگانے سے وہ بہت زیادہ اچھی لگتی تھیں، لیکن اس کاجل پسندی نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ میری خادمہ نے، جو میری آرائش کی ذمہ دار تھی، مجھے تاکید کر دی تھی کہ خبردار! تحفے یا عطیہ کے طور پر کاجل کبھی نہ قبول کرنا، کیونکہ محل سرا کی جو عورتیں دوسری عورتوں سے جلتی ہیں وہ اسے زہر آلود کر دیتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بینائی رخصت ہو جاتی ہے۔ نہ رہتا ہے بانس نہ بجتی ہے بانسری!

---

(۱۴)

خوانِ نعمت

محل سرا میں ایک طرف ہمارا اپنا پائیں باغ تھا، اگر خانگی زندگی سے جی اکتا جاتا تو ہم لوگ پائیں باغ میں آجاتے، ورزش کرتے، ٹہلتے اور گپ شپ میں مصروف ہو جاتے۔ یہیں یعنی باندیوں کو غلاموں سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان لوگوں کا حمام، مطبخ اور خواب گاہ ہر چیز جدا تھی، ان کا آمد و رفت کا دروازہ بھی الگ تھا۔

صبح چھ بجے ہم لوگ بستر سے اٹھ جاتے اس کے بعد ہم سب حمام پہنچتے، تہقہوں اور چہچہوں اور نوک جھونک کے درمیان ہمارے غسل کا سلسلہ جاری رہتا اس کے بعد کافی آجاتی اور چند ہلکے پھلکے کیک، دوپہر کو باقاعدہ کھانا ہوتا، پلاؤ، بریانی، کباب، قورمہ اور کوئی میٹھی چیز۔ لمبی سی ایک تپائی پر دسترخوان بچھا دیا جاتا۔ زمین پر آلتی پالتی مار کر تپائی کے دونو طرف ہم سب بیٹھ جاتے، کھانے کے دوران میں بات چیت کی نوبت بہت کم آتی، کھانا کھانے کے طریقہ میں یہ بات داخل تھی کہ داہنے ہاتھ کی دو انگلیاں اور انگوٹھا استعمال کریں، اس کے علاوہ

کسی اور طریقے سے کھانا بدتمیزی میں داخل تھا۔

میٹھی چیز میں زیادہ تر ٹیٹنگ ہوتی یا چاول کے بنے ہوئے اندر سے جنہیں عرق
گلاب میں گوندھا جاتا تھا۔ اور ان کے ارد گرد انگور کی پتیاں لپیٹ دی جاتی تھیں۔ کبھی
نیبو شہد کی بڑی بڑی تھیلیوں میں دبا کر سامنے رکھ دیا جاتا جس روز سلطان حرم سرا میں کھانا
کھاتے اور یہ تقریب اکثر ہوتی تو روزمرہ کے عام کھانے کے علاوہ بھی کئی قسم کی چیزوں
کا اضافہ ہو جاتا۔ کوئی بھی ترکی دعوت اس وقت تک مکمل نہیں ہو پاتی جب تک اس میں
مرغ اور پلاؤ اور زعفران سے بنی ہوئی کوئی میٹھی چیز نہ ہو۔

دعوت ختم ہونے کے بعد غلام چاندی کا ایک پیالہ جس میں گلاب کا عرق بھرا ہوتا
ہم میں سے ہر ایک کے سامنے لاتے۔ اسی میں ہم اپنی انگلیاں ڈبو کر دھو لیتے۔

---

(۱۵)

لولا

حرم سرا میں ایک بوڑھی عورت اکثر آیا کرتی تھی مشہور تھا اس کی عمر ایک سو دس سال کی ہے جیسے ہی یہ حرم سرا میں قدم رکھتی' نئی اور پرانی باندیاں اسے اپنے گھیرے میں لے لیتیں۔ یہ قسمت کا حال بتایا کرتی تھی۔

یہاں آنے سے ایک روز پہلے یہ اپنے کچھ عملیات کرتی تھی' پھر جب یہ آتی تو ہم میں سے ہر ایک کو از سر نو غسل کرنا پڑتا۔ جس طرح بچے کسی نئی چیز کے مشتاق ہوتے ہیں۔ اسی طرح حرم سرا کی باندیاں اس کے آنے کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو یقین تھا' یہ جو کچھ کہتی ہے وہ سچ ہے۔ مستقبل کے بارے میں اس کی بتائی ہوئی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی۔

عام طور پر یہ دوپہر کے کھانے کے بعد آیا کرتی تھی' اگر پہلے آجاتی تو ممکن نہ تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی دسترخوان کا رخ کرتا۔ کیونکہ اسے دیکھتے ہی مستقبل کی فکر پڑ جاتی تھی۔

ایک مرتبہ یہ جادوگرنی آئی تو حرم سرا کی ایک خوبصورت دوسری لڑکی آدنگا نے مجھ سے کہا۔

"اس مرتبہ یہ جادوگرنی کونسی نئی پیشین گوئی کرے گی؟"

میں نے جواب دیا۔

"مجھے تو نہیں معلوم"

ادلگا کہنے لگی

"پچھلی مرتبہ جب یہ آئی تھی تو اس نے مجھ سے کہا تھا میرا حسن و جمال روز افزوں ترقی کرے گا۔ اور یہ کہ وہ میرے بازو پر اور انگلیوں میں نہایت قیمتی جواہرات دیکھے گی"

ایک دوسری لڑکی نے جو اپنے حسن و جمال کی بنا پر ہم میں نمایاں حیثیت کی مالک تھی کہا۔

"پچھلی مرتبہ جب باسفورس میں ہماری کشتی لہروں کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی بہت سی خوبصورت اور نازک اندام خواصیں اور کنیزیں میرے گرد جمع تھیں۔ تو یہ جادوگرنی بھی ساتھ تھی اور اس نے بڑے دعوے کے ساتھ کہا تھا"

"وہ دن جلد آنے والا ہے جب تمہاری حیثیت بہت زیادہ اونچی ہو جائے گی۔ تم پہچانی بھی نہ جا سکو گی"

ہم لوگ اس جادوگرنی کے بارے میں اسی طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ اور ہمارے غلام ہماری لمبی لمبی زلفوں کو برش کر رہے تھے۔

ادلگا نے جو اس وقت عجیب اضطراب کے عالم میں کمرہ کے اندر ٹہل رہی تھی کہا۔

"آخر وہ کب آئے گی؟ میں بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ اسے جلد آنا چاہیئے۔ ہم سب اس کے انتظار میں چشم براہ ہیں"

ادلگا کی ان باتوں نے ہم سب کو اس جادوگرنی کا مشتاق بنا دیا۔ ہم نے جلدی جلدی اپنے غلاموں کو ... ضروری ہدایات دیں اور جادوگرنی کے انتظار میں تیار ہو کر بیٹھ گئے۔

اونگا نے کہا۔

"اب وہ آیا ہی چاہتی ہوگی، ہمیں استقبالیہ کمرہ میں چلنا چاہیے۔ وہ کافی کشادہ اور آرام دہ ہے۔ ہم سب اس میں بڑی آسانی سے سما سکیں گے"

اونگا کی بات ہماری سمجھ میں آگئی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور کاریڈور سے ہوتے ہوئے استقبالیہ ہال کی طرف روانہ ہوئے۔ سب پر خاموشی چھائی تھی۔ صرف ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ البتہ سنی جاتی تھی۔ باقی ہر شخص اپنی دھن میں مست تھا۔ اپنے خیال میں مگن انجانی باتوں اور آنے والے واقعات کی خبریں سننے کے لئے بے قرار اور بے چین۔

آخر کار ہم لوگ استقبالیہ کمرہ میں پہنچے۔ یہ ایک وسیع، کشادہ اور ہوادار کمرہ تھا۔ نہایت خوبی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ دیواروں کی پینٹنگ قابلِ دید تھی۔ مختلف مقامات پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے اور جگمگا رہے تھے، دیواروں کا کچھ حصّہ سونے کے پانی سے لگا ہوا تھا ایک بہت بڑا شمعدان رکھا تھا۔ اس میں اتنی موٹی شمع جل رہی تھی جیسے جارجیا کی پہاڑی پر دُور افق میں جاڑوں کا سورج چمک رہا ہو۔

ہم لوگ دیواروں سے لگ کر گاؤ تکیہ کی ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گئے اور ولا کا انتظار کرنے لگے۔ یہ اسی جادوگرنی کا نام تھا جس نے قسمت کا حال بتا بتا کر سب کو اپنا شیدا اور مفتوح بنا لیا تھا۔ ہر آنکھ اسی کا انتظار کر رہی تھی، ہر دل اسی کے لیے دھڑک رہا تھا۔ کان اسی کی آواز سننے کے لیے بے قرار تھے۔

اونگا مخملی پردے کے عین سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ زرد رنگ کے ساٹن کی قمیص زیب بدن تھی۔ ہرے رنگ کا پاجامہ پہنے تھی جس کی سلائی سونے کے دھاگے سے ہوئی تھی۔ قمیص پر سنہرے رنگ کی صدری جس پر ہیرے ٹکے ہوئے تھے۔

کئی لڑکیاں ایسی تھیں جو اونگا کی خوبصورتی اور جامہ زیبی پر حسد کیا کرتی تھیں،

لیکن وہ اپنی قدر و قیمت سے واقف تھی، حاسدوں کی ذرا بھی پروا نہ کرتی۔

دفعتہً لباس کی کھڑکھڑ اور ہیرے جواہرات کی جھنکار ہمارے پردہ گوش سے
ٹکرائی، پھر سنگ سرخ اور سنگ مرمر کے دروازے کھلے، لولا آہستہ آہستہ وقار
تمکنت کے ساتھ داخل ہوئی۔ یہ ایک پستہ قد عورت تھی، لیکن اس کی چمکدار آنکھو
اس غضب کی کشش تھی کہ ہر شخص اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا تھا۔ آتے ہی وہ مجھ
مخاطب ہوئی اور اس نے مجھ سے پوچھا:

"کہو وہ چھوٹی چھوٹی چڑیاں بھی تمھیں یاد ہیں جو تیر کی طرح باسفورس کے پا
ڈبکی لگا کر فضا میں پرواز کرنے لگتی تھیں؟"

پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر مدھم آواز میں اس نے سب کو سلام کیا
ہم سب نے یک آواز ہو کر کہا۔

"مرحبا۔ مرحبا! تشریف لائیے۔"

لولا نے انگلیوں کے سرے سے اپنے ہونٹ چھوئے۔ اس کے بعد دونو
سینے پر باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ یہی امر اس نے کمرہ کے ہر گوشے میں جا کر کیا۔
لولا فرش پر بیٹھ گئی، اتنے میں ایک غلام آیا، اس کے ہاتھ میں دو بیگ
وہ لا کر اس نے اس کے سامنے رکھ دیے۔ لولا تھوڑی دیر بیٹھی رہی، پھر لیٹ
جب دروازے بند ہو گئے اور ہمارے غلام نے ریشم کا خوبصورت پردہ
تو لولا پردے کے پیچھے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ ہم
اس پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سانس چل ر
رہی۔ بار بار اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا، پھر زمین پر اپنے ہاتھ پٹخنے لگی۔ پھر اس
بازو پھیلا پھیلا کر ایسی حرکتیں کیں جیسے وہ ایک چڑیا ہے اور اڑنا چاہتی ہے۔
تمام آنکھیں اس دبلی پتلی اور مخنی سی عورت پر جمی ہوئی تھیں، جو اپنی عجیب دعو

ہیئت اور اس سے زیادہ عجیب و غریب لباس کے باعث بجائے خود ایک عجوبہ بن گئی تھی۔

ہم میں سے کسی کی طرف دیکھے بغیر اس نے وہ بیگ کھولنا شروع کیے جو اس کے بالکل پاس ہی رکھے ہوئے تھے، بیگ سے چھوٹی چھوٹی پڑیاں نکال نکال کر وہ اپنے سامنے ڈھیر لگاتی گئی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں، پھر کہا:

"ایک ایک کر کے تم لوگ میرے سامنے آؤ۔"

یہ سلسلہ داہنے ہاتھ کی طرف سے شروع کیا گیا۔ جو باندی بھی اس کے سامنے پہنچتی وہ آہستہ آہستہ اس سے کچھ کہتی جسے کوئی دوسرا نہ سن سکتا۔

یہ کام شروع کرنے سے پہلے اس نے ہدایت کر دی تھی کہ خبردار! میرے عمل کے دوران میں تم لوگ آپس میں کوئی بات چیت نہ کرنا کیونکہ ان چیزوں سے جنات بھڑکتے ہیں اور خفا ہو کر چلے جاتے ہیں، پھر ان سے کچھ پوچھنا اور معلوم کرنا ناممکن ہو جائے گا۔

سب سے پہلے جو لڑکی اس کے سامنے پہنچی اس کا نام ستارہ تھا، لولانے اس کی ہتھیلی دیکھی، کانوں کا معائنہ کیا، پاؤں کی ایڑیوں پر ایک نظر ڈالی یہ سارے کام بڑی چابکدستی کے ساتھ اس نے انجام دیئے، پھر اس نے ایک چھوٹی سی عشتری بیگ میں سے نکالی اور ریت اور گرم مصالحہ کی سی کوئی چیز ملا کر اس میں ڈال دی، وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگی کبھی آگے کی طرف دیکھتی کبھی پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھنے لگتی۔ اس کی آنکھوں کی اس وقت عجیب کیفیت ہو رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالی پتلی غائب ہے اور صرف سفیدی ہی سفیدی نظر آ رہی ہے۔ اس کے بعد اس نے ستارہ کی طرف دیکھا اور اس کی قسمت کا حال بتانے لگی، مجموعی طور پر اس طرح کوئی پانچ منٹ صرف ہوئے ہوں گے۔

جب میری باری آئی تو خوف اور دہشت سے میرا منہ خشک ہو رہا تھا میں اپنی

جگہ سے اٹھ کر بدحواسی کے عالم میں گرتی پڑتی اس کے سامنے پہنچ کر کھڑی ہو گئی، سامنے ایک گدیلہ پڑا تھا، اشارہ پاکر اس پر بیٹھ گئی۔

لولا نے مجھے حکم دیا

"آنکھیں بند کر لو"

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

اس نے بھی آنکھیں بند کرلیں، پھر سات تک گنتی گنی، اس کے بعد کہا

"آنکھیں کھول لو"

ہم دونوں نے آنکھیں کھول لیں،

بھلا میری حیرت کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ جو عورت اب تک مجھے پستہ قد نظر آرہی تھی دفعتہً وہ لمبی تڑنگی نظر آنے لگی۔ وہ بدستور آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے بیگ سے ایک طشتری نکالی، یہ چاندی کی بنی ہوئی تھی، اس نے کچھ الفاظ کہے جنھیں میں بالکل نہ سمجھ سکی۔ پھر اس نے مٹھی بند کرلی۔ میں نے دیکھا ایک چھوٹا سا طباق اس کے ہاتھ میں تھا۔ جو دہکتے ہوئے انگاروں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

یہ جو کچھ نظر آرہا تھا میں چشم حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا یہ کیا ہے، یکایک لولا نے مجھے حکم دیا:

"بالکل خاموش بیٹھی رہو! خبردار جو ایک لفظ بھی منہ سے نکلا"

میں سراپا حیرت بنی اسے دیکھ رہی تھی، یکایک کیا دیکھتی ہوں کہ وہ ان دہکتے ہوئے انگاروں پر جھکی اور ان سے اتنی قریب ہو گئی کہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو ضرور جل جاتا، جھلس جاتا، لیکن لولا پر کوئی اثر نہ ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انگاروں کی تپش وہ محسوس ہی نہیں کرتی۔ پھر آنکھیں بند کرکے وہ اس طرح بولنے لگی جیسے کوئی خواب میں بولتا ہے، اس نے کہا:

"تم حسین و جمیل ہو، لیکن بہت جلد تمھارا حسن و جمال قیامت بن جائے گا ۔ اس حرم سرا میں بڑھ کر تم سے بڑھ کر خوبصورت اور با اقتدار کوئی نہ ہوگا ۔ تمھارے قبضہ اور تصرف میں سونا ہوگا ۔ جواہرات ہوں گے، غلام ہوں گے، لونڈیاں ہوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی یکایک اس کے منہ سے پھر الفاظ نکلنے لگے ۔

"تم سے حسد کیا جائے گا، تم سے رشک کیا جائے گا، تمھیں وہ مرتبہ حاصل ہوگا جو کسی اور کو نہیں حاصل ہو سکتا۔"

وہ پھر خاموش ہو گئی ۔ ذرا دیر کے بعد بولی،

"تم وہ ایام مسرت فراموش کر دو گی جو تمھارے وطن کی پہاڑیوں اور وادیوں سے وابستہ ہیں لیکن تمھیں وہ اقتدار حاصل ہوگا، وہ طاقت ہوگی جسے اگر سلیقے سے استعمال کرو تو بہت کچھ کر سکتی ہو، تم ذہین ہو، عقل مند ہو، میری یہ نصیحت یاد رکھنا کہ جب اقتدار و اختیار کی باگ تمھارے ہاتھ میں آئے تو عقل و خرد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ دینا اس لیے کہ قوت اور اقتدار بڑی خطرناک چیز ہے، یہ آدمی کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے، یہ انسان سے اقدار انسانی چھین لیتی ہے۔"

لولا کی آواز لرز رہی تھی ، اس کی جادوئی آگ بھڑک رہی تھی ۔ دہکتے ہوئے انگاروں میں وہ چمک اور سرخی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی جو اس وقت لولا کے سامنے رکھے ہوئے انگاروں میں نظر آ رہی تھی ۔ ذرا دیر کے بعد وہ خاموش ہو گئی ۔ اس کے خاموش ہوتے ہی وہ دہکتے ہوئے انگارے خاکستر میں تبدیل ہو گئے، اب نہ ان میں چمک تھی، نہ تپش ،

میں حیرت سے یہ تماشہ دیکھ رہی تھی کہ لولا نے کہا

"میری بچی ! یہ سب کچھ اسی طرح ان انگاروں کی طرح گزر جاتا ہے، چمک اور بھڑک سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ قائم رہے گی ۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی

اس میں ہرگز زوال نہیں آسکتا' لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے' بڑی تیزی سے موت کا پنجہ بڑھتا ہے اور سب کچھ اپنے ساتھ لے جاتا ہے' چمک دمک بھی اور تپش بھی ، ہمارا وجود ختم ہو جاتا ہمارا جسم خاکستر بن جاتا ہے۔

لولا نے پھر مجھے ایک پیکٹ دیا اور ہاتھ کے اشارہ سے رخصت ہو جانے کا حکم دیا' پھر وہ بولی:

"اسے ہمیشہ پہنے رہنا' تم سے زیادہ اس کا مستحق اور محتاج کوئی نہیں ہے۔"

میں کوئی جواب نہ دے سکی' میں نے خاموشی سے وہ پیکٹ لے لیا' اور احتیاط سے اسے مٹھی میں رکھ لیا' کہ اپنے کمرہ میں جاکر اطمینان سے جب کوئی نہ ہوگا تو کھولوں گی۔

دو گھنٹے تک یہ مجلس جمی رہی' پھر ریفریشمنٹ کا سامان آیا' میرے سامنے نہایت ٹھنڈا سنہرے رنگ کا شربت لایا گیا' میں اس طرح اس پر ٹوٹ کر گری' جیسے نہ جانے کب کی پیاسی ہوں' ایک ایک گھونٹ میں ایک نئی زندگی محسوس ہوئی۔

لیکن لولا نے ریفریشمنٹ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

لولا نے اپنی صدری کی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی' اس میں کوئی چیز رکھی ہوئی تھی' انگلی سے اسے ٹٹولا اور نکال لیا اور اسے منہ میں ڈال کر نگل گئی۔

یہ چیز نگل جانے کے بعد اس نے کہا

"یہ ہے میری غذا' اسے جڑی بوٹی سے میں نے تیار کیا ہے' میں گوشت کھاتی' چاول نہیں استعمال کرتی' کسی طرح کے اناج کو ہاتھ نہیں لگاتی' میں ابھی کم سے کم پچاس سال اور زندہ رہوں گی' ممکن ہے اس سے بھی زیادہ۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر لولا نے کہا:

آج مجھے بہت کچھ کرنا ہے' آج چاند کی پہلی رات ہے' دنیا کے اسرار سربستہ

آج ہی کی تاریخ میں مجھ پر منکشف ہوتے ہیں' اور یہی وجہ ہے بچیو! میں تمھیں قسمت کا حال بتا دیتی ہوں' جو کچھ میں نے کہا ہے اسے یاد رکھو۔"

ہم سب نے بیک آواز جواب دیا:

"ہم یاد رکھیں گے' ہم یاد رکھیں گے"

وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھی' دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک مرتبہ ہم سب کو مخاطب کیا اور کہا:

"کل میں پھر آؤں گی' اور ان جواہرات کے بارے میں تمھیں بتاؤں گی جنھیں استعمال کرنے کے بعد تمھاری قسمت سنور سکتی ہے۔"

تمام لڑکیوں نے مل کر کہا:

"ضرور تشریف لائیے گا' ہم بیتابی کے ساتھ آپ کا انتظار کریں گے۔"

استقبالیہ کمرہ سے نکل کر ہم لوگ اپنی اقامت گاہ میں آ گئے اور آرام دہ بستر پر دراز ہو گئے۔ باندیاں ہمارے ہاتھ پاؤں دابنے لگیں' اور ہم آپس میں اعتماد کا تبادلہ کرنے لگیں' یعنی لولانے جس سے جو کچھ کہا تھا وہ سب نے ایک دوسرے سے بیان کر دیا۔

لیکن میں نے کچھ باتیں کہیں اور کچھ چھپالیں' اس لیے کہ میں جانتی تھی کہ بعض لڑکیاں مجھ سے خار کھائے بیٹھی تھیں وہ خود اپنے خوش آئند مستقبل کا خواب دیکھ رہی تھیں' میری باتیں سن کر ان کے جذبات مجروح ہوں گے اور مجھ سے جلنے لگیں گی۔ مجھے بڑی فکر یہ تھی کہ لولا جو پیکٹ مجھے دے گئی ہے' اس میں کیا ہے؟

آخر خدا خدا کر کے رات آئی' میں اپنی خواب گاہ پہنچی' اب میں تنہا تھی۔ پھر بھی احتیاطاً اِدھر اُدھر دیکھ کر میں نے وہ پیکٹ کھولا' جس کپڑے میں وہ لپٹا ہوا تھا اسے ہٹایا' میرا اضطراب بڑھتا جاتا تھا کہ آخر اس میں کیا ہے؟ دھجیوں پر دھجیاں اتار اتار کر میں پھینکتی جا رہی تھی۔ مگر گوہر مقصود اب تک نظروں سے اوجھل تھا۔ آخر کپڑوں کی دھجیاں ختم ہوئیں۔

اور کاغذ کی تہہ نظر آئی، اسے کھولا تو ہڈی کا ایک ٹکڑا ملا، ہڈی کا ٹکڑا دیکھ کر میں اور زیادہ متعجب ہوئی، لیکن میری حیرت جلد رفع ہوگئی، اس کاغذ پر یہ تحریر درج تھی:

"یہ سیاہ خرگوش کی ہڈی ہے، یہ تمہیں حاسدوں سے محفوظ رکھے گی۔ جب تک یہ تمھارے پاس ہے کوئی زہر تم پر اثر نہیں کرے گا، اسے ہمیشہ پہنے رہو۔"

یہ عبارت پڑھ کر میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی، یہ بڑھیا مجھے اتنی بے وقوف سمجھتی تھی کہ اس کی باتوں میں آ کر یہ ہڈی میں اپنے گلے کا ہار بنالوں گی۔ حالانکہ یہ بدنما چیز نہ مجھے فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اسے اپنے پاس رکھنا کتنی مضحکہ خیز بات ہوگی۔ میں اٹھی اور اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا ——— خدا کا شکر ہے اس ہڈی سے نجات ملی!

---

(۱۶)

باسفورس کی سیر

حرم سرا کے حدود میں حبشی خواجہ سراؤں کے سوا کوئی مرد قدم نہیں رکھ سکتا تھا، حرم سرا میں رہنے والی تمام عورتوں اور لڑکیوں کی خاطر داشت، نگہبانی، خدمت اور نگرانی صرف انہی کے ذمہ تھی۔

مجھے ان بدنما موٹے، بھدے، کالے آدمیوں سے سخت نفرت تھی، کافی مدت کے بعد کہیں میں ان سے مانوس ہو سکی، حرم سرا کے قوانین میں یہ بات داخل تھی اور اس کا بڑا سختی سے خیال رکھا جاتا تھا کہ حبشی خواجہ سراؤں کے علاوہ کوئی مرد کسی کام سے بھی، کبھی اور کسی حالت میں حرم سرا کے اس حصہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا جہاں لڑکیاں اور عورتیں قیام پذیر تھیں، یہ حبشی خواجہ سرا حدود حرم میں وہی اختیارات رکھتے تھے، جو ایک شہریار کو اپنے حدود مملکت میں حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے اس اثر و اقتدار کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر عورت، خواہ وہ کسی درجہ اور مرتبہ کی ہو، ان کا لحاظ کرتی تھی اور کوئی ایسی بات نہیں کرتی تھی جس سے انھیں خشمگیں اور برہم ہونے کا موقع ملے
عزیزی نے مجھے بتایا کہ یہ خواجہ سرا، سلطانِ عالم پناہ کے کان ہیں نہیں، جو یہ کہہ

ہیں' اس پر وہ یقین کر لیتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ حرم سرا کی خواتین اور لڑکیاں بیش قیمت تحائف سے انھیں مالا مال کیا کرتی تھیں' ان خواجہ سراؤں کو ہیرے جواہر بہت مرغوب تھے' تحفہ میں زیادہ تر وہ انہی کو قبول کیا کرتے تھے۔

جو درخواستیں محل سرا کی لڑکیوں اور عورتوں کو سلطان کی خدمت والا میں پیش کرنا ہوتی تھیں' ان کا قاعدہ یہ تھا کہ سفید فام خواجہ سرا' جو چیف خواجہ سرا کے منصب پر ممتاز تھا' یہ درخواستیں وصول کیا کرتا تھا' اس کے توسل کے بغیر کوئی درخواست پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کا معمول یہ تھا کہ بائیں ہاتھ سے درخواست لیتا تھا اور داہنا ہاتھ تحفہ کے لیے سامنے کر دیتا تھا۔

جو درخواستیں پیش کی جاتیں یا جو محضرنامے گزارے جاتے ان کا ایک ایک حرف چیف خواجہ سرا خود پڑھتا تھا' اس کے بعد اگر مناسب سمجھتا تھا تو اپنی رائے یا سفارش کے ساتھ اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا دیتا تھا ورنہ ردی کی ٹوکری کافی وسیع و عریض تھی۔

محل سرا کے خواجہ سرا زیادہ تر حبشی تھے' ابی سینیا (ملک حبش) کے رہنے والے یہ دراز قامت اور بے انتہا تنومند ہوتے تھے' سر پر ایک خاص قسم کی کلاہ پہنتے تھے' جو خاص لمبی اور سیاہ رنگ کی ہوتی تھی' ریشمی کوٹ' یا لبادہ جس کی آستینیں انھیں اور زیادہ "دلچسپ" بنا دیتی تھیں' پاؤں میں زرد رنگ کے سلیپر'

کبھی کبھی ہمیں اجازت ملتی کہ تبادلۂ ماحول کے لیے جائیں' ذرا باسفورس کی سیر کر آئیں' جب کبھی یہ موقع ملتا تو ہماری خوشی حدِ بیان سے باہر ہوتی' حبشی خواجہ سراؤں کی نگرانی میں حرم سرا سے نکل کر ہم باسفورس کے کنارے پہنچتے اور بجروں میں بیٹھ کر بڑی دور تک لہروں سے کھیلتے' اڑتی ہوئی چڑیوں کی نغمہ طرازیوں سے مسرور ہوتے' دور و نزدیک کے جہازوں کے مستولوں پر نظر ڈالتے' آپس میں دل لگی' ہنسی مذاق

چھیڑ چھاڑ کرتے چلے جاتے۔

حرم سرا میں ہم سب باندیوں کی تعداد تین سو سے کسی طرح کم نہ تھی۔

باسفورس کی تفریح کے موقع پر اکثر سفید فام خواجہ سرا جو چیف خواجہ سرا کہلاتا تھا، ساتھ ہوتا، وہ ہمارے معاملات میں کسی طرح کی مداخلت نہ کرتا۔ ہماری ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ، دل لگی سے اسے کوئی سروکار نہ تھا، لیکن ہم میں سے کسی کو یہ اجازت نہ تھی کہ کوئی ایسی بات سرزد ہو سکے جو وقار و تمکنت کے خلاف ہو، ایسی صورت میں وہ زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ تنبیہہ کرتا، اگر اس کا اثر نہ ہوتا تو وہ رپورٹ کر دیتا اور پھر شکنجۂ عقوبت سے بچانے والی کوئی چیز نہ تھی، ہم سب اس انجام سے ڈرتے تھے اور حتی الامکان اس کی نوبت نہیں آنے دیتے تھے کہ وہ خفا ہو کر رپورٹ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

باسفورس میں بجروں اور کشتیوں پر سوار ہو کر جب ہم نکلتے، تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک نئی زندگی مل گئی ہے، تلخیوں اور رنج و الم کا کہیں پتہ بھی نہ ہوتا، مسرت و شادمانی ہمیں اپنی گود میں لے لیتی۔

ان بجروں اور کشتیوں کا ساز و سامان بھی قابلِ دید تھا، چھوٹے چھوٹے کمرے، بڑا سا ہال، مخمل کے پردے، نہایت آرام دہ گدیلے، کشتیاں ہچکولے کھاتی باسفورس کی لہروں پر رواں دواں چلی چلتیں، اوپر نیلا آسمان، نیچے سمندر کا نیلا پانی، آسمان پر چاند کا نکھار، کشتیوں پر ستاروں کا جھرمٹ ———— عجیب دلربا نظارہ ہوتا تھا یہ بھی۔

غلطہ (GALATA) کاپُل، جو شاخِ زرّیں ———— GOLDEN HARN کے دہانہ تک پھیلا ہوا تھا۔ شہر کی خوبصورتی اور دل آویزی کا جیتا جاگتا نہایت حسین اور سحر انگیز مرقع تھا، ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ شہر قسطنطنیہ واقعی خوابوں کا شہر ہے، اس کی بلند و بالا عمارتیں

اونچے مینار، پُرشکوہ اور شاندار مسجدیں اور وہ چھوٹے چھوٹے مینار، جو پاس کی سا
پہاڑیوں پر باز نطینی عہد کے مٹے ہوئے شہر کی یادگار کا کام دیتے تھے، میلوں تک
پھیلے ہوئے شاندار اور یادگار قصور و محلات نئے بھی اور پرانے بھی اور عہد قبل از
تاریخ سے تعلق رکھنے والے بھی، ان سب کا مجموعہ ایسا دلکش منظر پیش کرتا تھا، کہ جسے
بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے، دور سے یہ منظر دیکھئے تو ایسا لگتا تھا، جیسے
نیلے رنگ کی قاب میں ایک بڑا سا کیک رکھا ہو ——— غرض یہ شہر
نہیں تھا، جادو کی دُنیا تھی۔ اس کی دلکشی، دلربائی اور رعنائی، فکر و خیال پر ایسا
اثر چھوڑتی تھی جو خواب میں بھی باقی رہتا تھا۔

ہماری کشتیاں باسفورس کی لہروں پر مچلتی رہتیں، ہم لطف لیتے رہتے، گردش
شام و سحر سے غافل، مستقبل کے بارے میں پُرامید، حال سے بے پروا۔
خوبصورت اور رنگا رنگ کی چڑیاں ہماری کشتیوں کے ساتھ اڑتی رہتیں۔
ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ یہ چڑیاں درحقیقت حرم سرا میں رہنے والی ان
عورتوں کی روحیں ہیں جو یہاں شادمانی اور مسرت کی زندگی بسر کرتی تھیں، لیکن موت
کے بے رحم ہاتھ نے انھیں دنیا سے رخصت ہونے پر مجبور کر دیا اور اب قدرت نے
ان پر یہ احسان کیا تھا کہ پرندوں کی صورت میں یہاں پرواز کرنے کی اجازت دے
دی تھی، تاکہ اپنے عہد ماضی کی یاد کو تازہ کر سکیں، جس کی یاد جنت میں پہنچنے کے بعد
بھی ان کے دل سے نہیں گئی۔

حرم سرا سے باہر بہت سے کوشک اور محلات بنے ہوئے تھے، دھوپ میں
اُن کے سونے اور چاندی کے بنے ہوئے دروازے اس طرح چمکتے تھے کہ آنکھیں
خیرہ ہو جاتی تھیں، ان کوشکوں اور محلات کے برآمدوں میں لوگ بیٹھے ہوئے مختلف
موضوعات پر گپ شپ کیا کرتے تھے، ترکوں کی یہ عادت ہے کہ خوب باتیں کرنے

ہیں، ڈٹ کے کھاتے ہیں اور تبادلۂ خیالات کے لیے جب بیٹھتے ہیں تو اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ہم کشتیوں پر سے گزرتے، ان نظاروں سے بھی لطف اندوز ہوتے رہتے تھے جو عورتیں کسی کام سے گھر کے باہر نکلتی تھیں وہ یا تو مقنع استعمال کرتی تھیں، ورنہ پھر سر پر شوخ رنگ کی ایک چادر ڈال لیتی تھیں، عام طور پر کسان عورتیں اسی طرح باہر نکلتی تھیں۔

ہمارے بجرے باسفورس کی لہروں پر تیر رہے ہیں۔

کسی گھر سے نغمہ و موسیقی کی دلنواز صدائیں اٹھ رہی ہیں، شاید آج یہاں کوئی تقریب مسرت ہے، ہار پھول اور طرّے ہر طرف بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کسی دولت مند شخص کی محلسرا ہے، گھر کے آگے اور پیچھے کے رقبہ میں وسیع اور سرسبز و شاداب لان ہیں، حوضوں کے اندر فوارے لگے ہیں اور ان سے اچھل اچھل کر پانی بہ رہا ہے، یہ پانی اس طرح چمک رہا ہے جیسے چاندی کی زنجیر۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور ڈونگوں پر مہمان آ رہے ہیں۔ صاحب خانہ کی طرف سے تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ ان کا استقبال ہو رہا ہے۔ ان مہمانوں کی کشتیوں اور بجروں کے ساتھ گل فروشوں اور میوہ بیچنے والوں کی ایک جماعت بھی ڈونگوں پر ساتھ ساتھ سفر کر رہی ہے کہ شاید اس ذرا سے مختصر وقفہ میں کاروبار کا کچھ موقع مل سکے۔

اکثر ایسا ہوتا کہ ہم ان گل فروشوں اور پھل بیچنے والوں کی دل دہی اور حوصلہ افزائی سے اس کا سامان خرید لیا کرتے، کافی پھل خرید لیتے اور ان کے چھلکے اور گٹھلیاں پانی میں پھینکتے جاتے۔

وقت کا مسافر آہستہ آہستہ چلتا رہتا

یہاں تک کہ دن ڈھل جاتا، سورج آرام کرنے کے لیے مغرب کے خلوت کدہ میں چلا جاتا۔

دن کی روشنی، شب کی تاریکی سے بدل جاتی۔

اور مساجد کے میناروں سے موذن اذانیں دینے لگتے ——————

اللہ اکبر —————— اللہ اکبر ——————'

یہ آواز سن کر، ہم پھر خواب و خیال کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجاتے

ان الفاظ میں کتنا جادو تھا، کیسا اعجاز تھا،

'آؤ'، خدا کی طرف آؤ'

'خدا بڑا ہے'

'فلاح کا راستہ اختیار کرو'

'خدا ایک اور صرف ایک ہے'

'اور محمد اس کے رسول برحق ہیں'

اذان کے بعد گشتی کھینے والوں کو واپسی کا حکم دے دیا جاتا، نشاط و طرب کی دنیا سے رخصت ہو کر فکر و الم کی دنیا میں ہم پھر واپس آجاتے۔

---

(۱۷)

قسمت پر پتھروں کا اثر

باسفورس کی سیر سے واپس ہوتے ہوتے رات کی تاریکی ہر طرف پھیل گئی - شہر کا گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ اس طرح جگمگانے لگا جیسے اندھیرے میں روشن اور چمکدار آنکھیں یہاں تک کہ ہم حرم سرا کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں کے پاس پہنچ گئے - اس وقت ہر چہار طرف سناٹا چھایا ہوا تھا - وہ چھوٹی چھوٹی چڑیاں جنھیں بعض لوگ روحوں سے تعبیر کرتے تھے بسیرے لینے کے لیے نشیمن میں اور ٹہنیوں پر آرام کرنے کے لیے آگئی تھیں، نیلا آسمان اس طرح نظر آرہا تھا جیسے کسی نے مخمل کا پردہ تان دیا ہو -

جیسے ہی ہم نے زینے پر قدم رکھا ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی درد بھرا گیت گا رہا ہے میں نے اپنی ایک سہیلی سے دریافت کیا :

"اس درد و سوز کے ساتھ کون گا رہا ہے ؟"

وہ ہنسنے لگی، اس نے بتایا،

"یہ ایک ترک ملاح ہے جو دیر سے اپنے گھر واپس جا رہا ہے اور اس طرح گا کر اپنا حوصلہ قائم رکھنا چاہتا ہے ۔"

دروازہ پر پہنچ کر ہم کھڑے ہو گئے۔ قبل اس کے وہ کھلیں میں نے آسمان پر ایک باریک سا نشان دیکھا۔ یہ نیا چاند تھا، میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر جیسا کہ ہمارے ہاں جارجیا میں قاعدہ تھا دعا مانگی کہ اے اللہ! یہ نیا چاند ہمارے لیے خیر و برکت کا مہینہ بنا۔ اتنے میں ہمارا خواجہ سرا آیا۔ پھاٹک کی کھڑکی سے ہمیں جھانک کر اس نے دیکھا پھر اس نے غلاموں کو حکم دیا کہ پھاٹک کا تالہ کھول دیں۔ بائیں باغ میں ہوتے ہوئے پہرے دار سپاہیوں کے پاس سے گزرتے ہم اپنی اقامت گاہ تک پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر ہم نے لباس تبدیل کیا، جوتے اتارے، غلاموں نے ہمارا بستر ٹھیک کیا۔ اتنے میں اطلاع ملی کہ دسترخوان تیار ہے، ڈائننگ ہال سے واپس آنے کے بعد کچھ دیر تک ہم نے کشیدہ کاری کا کام کیا، صدریاں، پائجامے اور لبادے ہماری سوئی کے ہدف بنتے رہے۔ والدہ سلطان کا یہ فرمان تھا کہ ہر روز ہمیں کچھ نہ کچھ کام کرنا چاہیے اور دوسرے روز معائنہ کے لیے ان کے پاس بھیج دینا چاہیے۔

ہمارا غلام ہماری تیار کی ہوئی چیزیں لے کر جب والدہ سلطان کی خدمت میں جاتے تھے تو بڑی بے چینی اور اضطراب کے ساتھ ہمیں انتظار رہتا کہیں ایسا نہ ہو وہ ہمارے کام کو ناپسند کر دیں، اور یہ دیدہ ریزی بے کار ہو جائے۔ ایک دن اسی طرح ہم نے اپنا تیار کیا ہوا کام علیا حضرت کی خدمت میں بھیجا، کوئی ایک گھنٹہ کے بعد غلام یہ چیزیں لے کر واپس آیا اور اس نے حرم سرا کی چودھرائن سے کہا کہ والدہ سلطان یہ کام دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے ان پارچات کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ ساتھ ساتھ جواہرات سے بنے ہوئے کچھ جڑاؤ زیورات بھی غلام نے چودھرائن کے حوالے کیے کہ ہر سُوٹ کے ساتھ ایک ایک لڑکی کو عطا کر دیں۔ میرے حصہ میں یاقوت کا نکلس اور بازو بند آیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ لباس بھی جو نہایت دیدہ ریزی اور کاوش کے ساتھ سونے کے دھاگے سے بڑی احتیاط اور فن کاری

ساتھوں نے تیار کیا تھا۔ یہ تحائف پا کر ہم سب کو اتنی خوشی ہوئی کہ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اتنا شاندار لباس اتنا قیمتی زیور ہمارے تصوّر اور امید سے کہیں زیادہ تھا۔ میری خوشی بھی حد بیان سے باہر تھی، یہ سوٹ پہن کر واقعی میرے حسن میں چار چاند لگ گئے۔ مجھے امید تھی کہ سہ پہر کو جب لولا آئے گی تو سُرخ رنگ کو ضرور میری قسمت کے مطابق بتائے گی۔

بڑی دیر تک خوشی اور مسرّت کے ساتھ ہم لوگ آپس میں باتیں کرتے رہے اس کے بعد عبادت کے کمرہ میں پہنچے کیونکہ لولا کے آنے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔

مشکل سے ہم اپنی نشستوں پر بیٹھ پائے ہوں گے کہ وہ آگئی، اس کے انداز و اطوار وہی تھے جو ہمیشہ سے چلے آ رہے تھے وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی آئی اور ہال کے وسط میں اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

"آیئے تشریف لایئے —————" ہم نے یک آواز ہو کر کہا۔

"خدا تم سب کی قسمت سنوارے" ————— لولا نے جواب دیا

لولا کو دیکھ کر ہر چہار طرف سے مختلف قسم کے سوالات شروع ہو گئے۔

کسی نے کہا۔

"ایسا کیجیے کہ میری باری جلد آ جائے"

کسی نے پوچھا

"اس نئے چاند میں آپ نے کیا کیا دیکھا؟"

ایک طرف سے آواز آئی

"کیا یہ مہینہ مبارک اور صحت بخش ثابت ہوگا؟"

اس طرح کے بہت سے سوالات، بے صبری اور بے قراری کے ساتھ لولا سے کر ڈالے گئے۔ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"بچیو! جلد بازی سے کام نہ لو، صبر کرو، تم نوجوانوں کی کچھ عادت ہے کہ کچھ نہیں
سنتیں، تم ہی سے ہدایت کی باری آئے گی۔ لیکن آج میں تم سب کو مخاطب کر کے
پتھروں کی اچھائی اور برائی کا بیان کروں گی، خوب توجہ سے میری بات سنو! جب تک میں
بولتی رہوں چپ بیٹھی رہو، خبردار! میری بات کاٹنے کی کوشش نہ کرنا، اس سنئے چونکہ
میں نے بہت کچھ معلوم کیا ہے، میں ستاروں کی چال پہچانتی ہوں، اس علم نے مجھ میں وہ توانائی
پیدا کر دی ہے کہ تمہاری طرح میں بھی اپنے آپ کو جوان محسوس کر رہی ہوں، علم انسان کو ہمیشہ
جوان رکھتا ہے، میری بچیو! اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا، میں دیکھ رہی ہوں تم سب موتیوں
کی مالا پہنے ہوئے ہو، لہٰذا میری گفتگو کا آغاز موتیوں ہی سے ہوگا۔"

لوئی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"موتی پاکی اور طہارت کا نشان ہیں۔ ایک مرتبہ پہننے کے بعد اگر ان کی ناقدری
کی جائے اور انہیں اتار دیا جائے تو ان میں رشک و حسد کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے، پھر ان
کی آب جاتی رہتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ رونے لگتے ہیں اور اسی گریہ کے
باعث ان کا رنگ ماند پڑ جاتا ہے، لہٰذا تمہیں چاہئے کہ موتی ایک مرتبہ پہننے کے بعد
کبھی نہ اتارو، موتیوں میں یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنے پہننے والے کو خوش اور مطمئن رکھتے
ہیں۔ بہت دنوں کی بات ہے، شاید یہ کہانی تم نے بھی سنی ہو کہ اپنے زمانہ کی ایک والدۂ
سلطان، باسفورس میں بجرے پر بیٹھی سیر کر رہی تھی کہ ان کا ہار پانی میں گر گیا، اس واقعہ کے بعد
والدۂ سلطان نے پھر زندگی بھر خوشی و خرمی کا منہ نہیں دیکھا، دل شکستگی کے عالم میں
دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس سیاہ بختی کا مقابلہ نہ کر سکی جو اس کا تعاقب کر رہی تھی۔"

ہم سب بڑی توجہ سے لوئی کی باتیں سن رہے تھے، وہ کہہ رہی تھی۔

"ہیرے پر ———— میں دیکھ رہی ہوں تم میں سے اکثر لڑکیاں کسی نہ کسی شکل میں
ہیروں کا استعمال کرتی ہیں، یاد رکھو کہ اگر پہننے والے کا دل پاک ہے تو ہیرے کا عکس

مستقبل کو ضرور تابناک کر دے گا۔"

لولا کے منہ سے یہ الفاظ جیسے ہی نکلے ہم سب نے جلدی جلدی اضطراب اور پریشانی کے عالم میں اپنی اپنی انگوٹھیوں اور پونچیوں کا معائنہ شروع کر دیا۔ جن میں ہیرے کے نگینے جڑے ہوئے تھے۔

لولا نے اس سلسلہ میں مزید کہا۔

"برے اور خاصکر نیلے رنگ کے ہیرے ان لوگوں کی قسمت بنا دیتے ہیں۔ جو دولت اور اقتدار کے متمنی ہوں، لیکن اس سلسلہ میں میری ایک بات نہ بھولنا! کسی شکل میں بھی جب کوئی ہیرا استعمال کرتا ہو تو اسے از سر نو ترشوا لینا چاہیے۔ کیونکہ اپنے اپنے مالک کی بدبختی یہ اپنے ساتھ لاتے ہیں، اگر ان کا پہلا مالک بدبخت تھا تو نئے مالک کو بھی بدبختی ہی ملے گی۔ یہاں تک کہ اگر تم کسی دوسرے کا ہیرا عارضی طور پر لو تو بھی اس کے جو اثرات اصل مالک کے لیے تھے وہ سب کے سب تمہاری طرف بھی منتقل ہو جائیں گے۔"

لولا کی یہ عجیب غریب باتیں ہم بڑے انہماک اور توجہ سے سن رہے تھے، اور وہ اپنی معلومات کا دریا بہائے چلی جا رہی تھی۔ اس نے کہا

"یاد رکھو! ہیرے اپنے اندر بغض اور کینے کا ایک ایسا مادہ رکھتے ہیں کہ اگر کسی وجہ سے یہ اپنے پہننے والے کو ہدف انتقام نہ بنا سکیں تو کم از کم ناکارہ اور نکمے ضرور بہر حال بن جاتے ہیں۔"

لولا نے بتایا۔

"زمرد ایک پتھر ہے جو پہننے والے کے دل کو شجاع اور بہادر بنا دیتا ہے یہ اپنے ساتھ خوش قسمتی لاتا ہے اور اسے قائم بھی رکھتا ہے۔ اسے سونے کے تعویذ میں رکھ کر اس طرح پہنو کہ یہ دل کے قریب رہے۔ پہننے والے کی صحت بہت عمدہ اور قابل رشک ہو جائے گی اور اگر کہیں اس کی ولادت جنوری کے مہینہ میں ہوئی ہو پھر تو اس کے سعد اثرات کا اندازہ

ہی نہیں کیا جا سکتا۔"

لولا نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"اب میں تمھیں یاقوت کے متعلق کچھ بتاؤں گی' میرے اور گرد جو لڑکیاں بیٹھی
ان میں کسی کی گردن اور بازو پر تجھے وہ چمکتا نظر آ رہا ہے۔ یاد رکھو یاقوت جواہرات کا
ہے' اسے پہننے والا ہمیشہ خوش رہے گا۔ تازہ دم رہے گا' اس کی دبی ہوئی صلاحیتیں ابھریں
گی' لیکن مغرور آدمی کو یہ راس نہیں آتا' بچیو! تم دیکھتی ہو کر جواہرات کے بارے میں
طرح باتیں کر رہی ہوں جیسے وہ حس اور جذبہ کے مالک ہوں' ہاں! واقعہ یہی ہے ان کا
شدید اور جذبہ بہت تیز ہوتا ہے' یہ میں نے بڑے گر کی بات بتائی ہے اسے ہمیشہ یاد
رکھنا' ایک بات اور گرہ میں باندھ لو' یاقوت کو جو چیز سب سے زیادہ ناپسند ہے وہ کینہ
اور سختی ہے' خاص طور پر ان لوگوں میں تو اس کمزوری کو وہ برداشت ہی نہیں کر سکتا جو
فروری میں پیدا ہوئے ہوں۔ کیونکہ اس مہینے میں پیدا ہونے والے لوگوں پر اس کا اثر زیادہ
لولا کی یہ باتیں سن کر میں نے محسوس کیا کہ جذبات کی شدت سے میرا چہرہ تمتما
ہے' شاید اس لئے کہ میری ولادت فروری میں ہوئی تھی' میرے گلو بند اور پونچی میں
جڑے ہوئے تھے' اس کے معنی یہ تھے کہ میں بڑی خوش قسمت ہوں' یاقوت میرا ہمدم
دمساز ہے۔

بڑی دیر تک جواہرات کے بارے میں لولا تقریر کرتی رہی' پھر اس نے پوچھا۔
"کیا کوئی اور ایسا پتھر بھی ہے جس کے بارے میں تم کچھ معلوم کرنا چاہتی ہو؟"
لیکن ہمارے ذہن میں کوئی نیا نام نہ آیا' اب ہم نے اس سے فرمائش کی
وہ اپنا کچھ کمال دکھائے۔ اس نے کچھ جادو کی کرتب دکھائے اور چلی گئی۔
اس کے جانے کے بعد کافی دیر تک ہم اس کی حیرت انگیز باتوں پر غور کرتے
رہے۔

---

(۱۸)

بادشاہ ایک ـــ باندیاں بہت سی

ہم میں سے چند لڑکیاں والدۂ سلطان کی مہربانی اور عنایت سے ترقی اور عروج کے مدارج تیزی سے طے کر رہی تھیں۔ ان میں ایک میں بھی تھی۔ اب ہم پہلے سے زیادہ شاندار آراستہ پیراستہ اور مرصع مکان میں آ گئے تھے، محکمۂ اُمورِ حُسن کو تاکید تھی کہ وہ ہم میں زیادہ سے زیادہ جلا پیدا کرے۔

ہر لڑکی جو خرید کر باندی کی حیثیت سے یہاں لائی گئی تھی، اسے کچھ نہ کچھ کام کسی نہ کسی محکمے سے وابستہ رہ کر کرنا پڑتا تھا، ہر محکمہ کی ایک سربراہ تھی، اور جو لڑکیاں جس محکمے سے وابستہ ہوتیں، اس کی ماتحتی میں اپنے فرائض انجام دیتیں، خواہ وہ فرائض امورِ خانہ داری سے متعلق ہوں یا سینے پرونے سے یا کشیدہ کاری سے یا کسی اور چیز سے۔

چند لڑکیوں کے ساتھ میں ایک ذہین ایرانی خاتون کی ماتحتی میں دے دی گئی۔ ہمارا یہ مختصر سا گروپ مختلف قومیتوں کا مجموعہ تھا، عرب، سرکیشیا، روس، آسٹریلیا، فرانس اور مصر کی لڑکیاں اس گروہ میں شامل تھیں، ہم سب بڑی محبت اور پیار و پیار سے زندگی بسر کرتی تھیں۔

ہماری نئی قیام گاہ امیرانہ ٹھاٹھ کے ساتھ آراستہ کی گئی تھی، ڈائننگ روم کی لمبائی اور چوڑائی سو فٹ تھی، کمروں کی دیواریں زنگاری رنگ کی تھیں، ہر رنگ اتنا چوکھا اور نظر افروز کہ آنکھ وہاں جا کر ٹھہر جاتی، کمرہ کی چھت یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ہم نیلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہیں اور جب شمع جلتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے چاند چمک رہا ہے۔

ہر کمرے کے فرش پر نہایت دبیز خوبصورت اور قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ جو ایران سے منگائے گئے تھے۔

کمرے کی کھڑکیاں شیشے کی طرح تھیں؛ ہال کے ستونوں کے اوپر اور نیچے مختلف رنگوں کے نگینے جڑے ہوئے تھے، کھانے کے بعد بھی بڑی ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوئے ہم لوگ مٹھائی یا پھلوں کے شربت سے شغل کیا کرتے۔

پہلے ہم لوگ گینہ کاری کے محکمے سے تعلق رکھتے تھے اب ہمارا تعلق محکمہ افزائشِ حسن سے تھا، یہ ایک خوشگوار تبدیلی تھی، مختلف قسم کے صندلی نسخوں سے کام لے کر غازہ، عطر اور دوسری چیزیں سلطان معظم کی دوسری بیوی کے لیے تیار کرنا پڑتی تھیں۔

میری اور عزیزی کی زندگی ہنسی خوشی بسر ہو رہی تھی، ہم اس لئے اور زیادہ خوش تھے کہ ہماری رفاقت بدستور قائم تھی، ہمیں اندیشہ تھا کہ ایک محکمے سے دوسرے محکمے میں تبدیل ہونے وقت میں کہیں ہوں گی اور عزیزی کہیں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ اندیشہ بے بنیاد ثابت ہوا، ان محکموں کی سربراہ جو خواتین تھیں انکا بھی بڑا جاہ و جلال تھا، ان کے لئے الگ کوشک تھا، ان کے خادم اور غلام بھی الگ تھے، ان کا جامہ خانہ، توشہ خانہ بھی جدا تھا، ان کے پاس جو خواجہ سرا تھے وہ بھی صرف انہی کے تھے، روپے پیسے کی انھیں کمی نہ تھی، جتنا چاہیں خرچ کریں، مرتبے کے لحاظ سے یہ سلطان معظم کی بیوی کی حیثیت رکھتی تھیں، اگرچہ ان سے باقاعدہ شادی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یہ سلطان کی مرضی پر منحصر تھا جس سے چاہیں شادی کر لیں۔

واقعہ یہ ہے ہم میں سے ہر ایک کو یہ معلوم تھا کہ ہمیں ایک خاص نہج پہ مخصوص

کی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور کیا جا رہا ہے، اور یہ سب کچھ سلطانِ معظم کی والدہ محترمہ کے حکم سے کیا جا رہا ہے۔ اس تعلیم و تربیت کا مقصد یہ تھا کہ وقت آنے پر انہیں بھی کسی محکمہ کا سربراہ بنا دیا جائے۔ نیز یہ کہ ہماری تعلیم و تربیت میں یہ امر بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا کہ وقت آنے پر ہم میں سے کوئی سلطان کی محبوبہ کے درجہ تک بھی پہنچ سکے، باندی کی حیثیت سے نہیں، بیوی کی حیثیت سے۔ ـــــ سلطان کی موجودہ محبوبہ ایک فنکار رقاصہ تھی، جو قصرِ شاہی میں داد عیش دے رہی تھی۔

سلطانِ معظم اپنے التفات اور توجہ کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتے تھے ایسے موقعہ پر جو لڑکی نگاہِ انتخاب میں آتی اسے نقاب اتارنے کا حکم دیا جاتا۔

جب حرم کے باغیچے میں ہم ٹہلنے کے لئے جاتے تو تمام مردوں کو باہر نکل جانے کا حکم دیا جاتا۔ اور حبشی خواجہ سراؤں کو تاکید کر دی جاتی کہ کوئی مرد یہاں قدم نہ رکھ سکے۔ یہ خواجہ سرا ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ٹہلا کرتے۔ اور اگر کوئی مرد نظر آ جاتا تو اس کی گردن فوراً اڑا دی جاتی اور پھر اسے سلطان کی خدمت میں پیش کیا جاتا، جس پر اسے بیش قرار رقم انعام کے طور پر عطا کی جاتی۔

ایسے مواقع پر کبھی کبھی سلطان بنفسِ نفیس باغ تشریف لے آتے، اور ہم میں سے کسی لڑکی کو مخاطب کر کے گانے یا ناچنے کا حکم دیتے، یہی وہ وقت ہوتا جب اکثر لڑکیاں رشک و حسد سے جل مرتیں، کیونکہ سلطان ایک تھا! ــــــــــــ اور باندیاں بہت سی!

---

(۱۹)

دُنیا کی ہر راحت میسّر تھی — مگر؟

حرم سرا کے باغات بہت وسیع اور کشادہ تھے۔ ان کے چاروں طرف ایک فصیل کھچی ہوئی تھی۔ جس کا رنگ سفید تھا فصیل پر مختلف برج بنے ہوئے تھے۔ اور کئی دروازے تھے، چند کا رُخ شہر کی طرف تھا صدر دروازہ بھی شہر ہی کی طرف کھلتا تھا۔ یہاں چوکی پہرے کا بڑا سخت انتظام تھا۔

وقت مقررہ پر باغ میں ٹہلنے کے لئے ہمیں جانا پڑتا۔ پھر اگر ہم میں سے کسی کی مرضی ہوتی تو بجرے پر بیٹھ کر آبشاروں کی سیر کرنے کی ممانعت بھی نہیں تھی، نصف گھنٹے میں کافی دور تک آمد و رفت ممکن تھی۔

باغ میں ایک کنواں تھا، یہ کنواں چیف خواجہ سرا کے لئے گنج گراں بہا کی حیثیت رکھتا تھا۔ حرم سرا کی لڑکیوں کا خیال تھا بلکہ کہنا چاہیئے عقیدہ تھا کہ اگر اس میں کوئی قیمتی چیز پھینکا جائے تو بگڑی ہوئی قسمت بن جاتی ہے اور بنی ہوئی قسمت چمک جاتی ہے۔ تقریباً یہ سب کے سب اپنی کوئی نہ کوئی چیز خواہ وہ نکلس ہو یا پہنچی، یا انگوٹھی، قسمت بن جانے کی امید میں ضرور کنوئیں کے اندر پھینکا کرتیں۔ ظاہر ہے ان سب کی قسمت تو نہیں بن سکتی تھی۔ دو ایک ہی

ہوتی ہوں گی جن کے حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی واقع ہوتی ہو گی اسی سے لڑکیاں امید قائم کر لیتی تھیں۔ بعد میں مجھے دلاسے معلوم ہوا کہ چیف خواجہ سرا نے اپنا ایک آدمی خاص اس مقصد کے لئے مقرر کر رکھا تھا جس کا کام یہ تھا کہ لڑکیوں کے جانے کے بعد جال ڈال کر کنوئیں سے ساری پھینکی ہوئی چیزیں نکال لے جسے بازار میں بیچ کر وہ کافی دولت کما لیتا تھا جہاں تک میرا تعلق ہے میں ایک دن بھی اس حماقت کی حصہ دار نہیں بنی۔

حرم سرا میں میری ہم عمر بہت سی لڑکیاں تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی میں نے خوش و خرم نہیں دیکھا تھا، ان میں سے کچھ وہ تھیں جن کے والدین حالات سے مجبور ہو کر انھیں فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے، کچھ ایسی تھیں جو بردہ فروشوں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں اور ٹھوکریں کھاتی یہاں آ گئی تھیں یہاں آنے کے بعد ان کے رہن سہن اور طور طریقہ میں نمایاں تبدیلی ہوئی تھی۔ دنیا کی وہ کون سی راحت تھی جو یہاں انھیں میسر نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کا دل یہاں نہیں لگتا تھا۔ یہ فرار کی تدبیریں سوچا کرتی تھیں۔ کتنا آسان تھا بجرے میں بیٹھ کر باسفورس کی لہروں میں سرگشت کرنا، اور کتنا مشکل تھا دروازے سے باہر نکلنا، جہاں قدم قدم پر چوکس پہرے دار ننگی تلواریں لئے پہرہ دیتے رہتے تھے، بہادر سے بہادر آدمی بھی ان کے سامنے سے گزرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میری روح لرزنے لگتی تھی، جب میں یہ سنتی تھی کہ کچھ لڑکیاں بھاگنے کی سازشیں کر رہی ہیں تو میں حیران ہو کر سوچا کرتی کہ آخر کس راستے سے یہ جانے کی جرأت کر سکتی ہیں؛ اور اگر یہ جرأت انھوں نے کی بھی تو کیونکر ممکن ہے کہ پہرہ داروں کی نظروں سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔؟

باغ کی سیر سپاٹے سے فارغ ہو کر اکثر ہم بالکنی میں آ کر بیٹھ جایا کرتے

یہاں سے سمندر کا نظارہ بہت صاف دکھائی دیتا تھا، اس نظارے سے لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ پورے اطمینان اور یکسوئی سے ہم اپنا مشغلہ بھی جاری رکھتے۔

جب یہاں سے جی اکتا تا تو ہم آرام کمرہ میں چلے جاتے۔ رقص ونغمہ کے علاوہ فنون لطیفہ کی تعلیم بھی ہمیں دی جاتی، یہ تک ہمیں سکھایا جاتا کہ چلنا کس طرح چاہئے کھڑا کس طرح ہونا چاہیئے؟ کمرہ میں کس طرح داخل ہونا چاہیئے؟ نکلنا کس طرح چاہیئے؟ بیٹھنا کس طرح چاہئے اور اٹھنا کس طرح چاہیئے؟ ہر پانچ لڑکیوں پر ایک خاتون نگران اور سربراہ کی حیثیت سے مقرر تھی جسے تادن کہتے تھے یعنی، چیف گورنرس۔

تعلیم وتربیت کا مرحلہ بھی بڑا دلچسپ ہوتا ہماری حیثیت بالکل بچوں کی سی تھی، اگر "سبق" اچھی طرح یاد ہوتا تو ہمیں شاباش دی جاتی، ہماری ذہانت کی تعریف کی جاتی، ہمارے لئے حوصلہ افزا الفاظ استعمال کئے جاتے، اگر نہ یاد ہوتا، تو ہمیں گاؤدی کہا جاتا، غبی اور کند ذہن قرار دیا جاتا، ملامت کی جاتی، اور ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لینے میں دریغ نہ کیا جاتا۔ تعلیم وتربیت کے مرحلہ سے فارغ ہوکر ہم حمام کرنے جاتے، یہاں باندیاں اور لونڈیاں ہمیں خوب مل مل کر نہلاتیں۔

یہاں سے فارغ ہوتے ہوتے رات کے کھانے کا وقت ہو جاتا، اور ہم اکٹھے ڈرائنگ ہال میں پہنچتے، جس کے خوشنما اور طرح طرح کے نگینوں سے جگ مگ کرتے ہوئے ستون آنکھیں خیرہ کردیتے، اس ہال کا فرش تمام تر سنگِ مرمر کا تھا جس پر نہایت خوشنما اور قیمتی غالیچہ بچھا تھا۔

یوں تو ہر وقت کا کھانا خاصا پرلطف ہوتا لیکن رات کا کھانا خاص طور پر انواع واقسام کا ہوتا، اور تکلف کی حد کردی جاتی، ہوتے چاندی کی پلیٹوں اور طشتریوں میں کھانا ہمارے سامنے لایا جاتا اور ہم جس شوق و ذوق سے کھانا کھاتے اسی

ذوق وشوق سے آپس میں چہلیں کرتے۔

ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد ہم سب آرام کمرے میں واپس آجاتے۔ یہاں باندیوں کی ایک ٹولی جب تک ہماری خواہش ہوتی اپنے ناچ اور گانے سے ہمیں محظوظ کرتی۔ دو ایک باندیاں ستار کا شغل جاری رکھتیں۔ پھر کچھ باندیاں اٹھ کر ہمارے کمرے کو طرح طرح کی خوشبوؤں سے معطر کر دیتیں۔ ہمارے ہاتھوں پر بھی عطر ملا جاتا۔ پھر کافی آتی، سونے کی ٹرے میں چھوٹی چھوٹی چینی کی پیالیوں میں ہمارے سامنے پیش کی جاتی۔

موسم سرما میں برابر انگیٹھی جلتی رہتی جس سے کمرہ گرم رہتا۔ گرم راکھ برتنوں کے نیچے رکھ دی جاتی تھی تاکہ وہ بھی ٹھنڈے نہ ہونے پائیں۔ کافی سے فراغت کے بعد اکثر ہم لوگ انگیٹھی کے گرد بیٹھ جاتے اور آگ تاپا کرتے۔

باندیوں کی نغمہ سرائی اور رقص سے محظوظ ہونے کے بعد کچھ دیر تک ہم آپس میں گفتگو کرتے رہتے، اس کے بعد خوابگاہ کا رُخ کرتے اور بے خبر سو جاتے۔ سونے کے لئے بستر پر لیٹنے کے بعد بھی کچھ دیر تک گپ شپ کرتے جس کا موضوع زیورات، پارچہ جات اور آئندہ کی خوش آئند زندگی کا خاکہ ہوتا۔

(۲۰)

جہاں عورتیں بکتی تھیں!

ایک رات عجیب واقعہ پیش آیا، اولگا ہمارے پاس آئی، اس نے کہا،

"میں بڑی عجیب خبر لائی ہوں!"

ہم لوگ اشتیاق و اضطراب کے ساتھ اُس کی طرف دیکھنے لگے، کہ کیا کہتی ہے؟

اولگا نے کہا۔

"بھلا بتاؤ تو میں کیا کہنے والی ہوں؟"

میں نے ذرا تلخ لہجے میں اس سے کہا۔

"اولگا پریشان نہ کرو، جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو"

اولگا مسکرائی، پھر کہنے لگی،

"کسرٰی آغا کا معاون حبشی خواجہ سرا آج پھر بازار غلاماں گیا ہے"

یہ سنتے ہی ہم سب میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور چاروں طرف سے اولگا بیچاری پر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔

"بازار غلاماں؟"

"لیکن کیوں ؟"

"آخر مقصد کیا ہو سکتا ہے اس کا ؟"

اولگا ہنسنے لگی ۔ اُس نے کہا ۔

"شہر کے ایک گوشہ میں عورت بازار کے نام سے ایک نئی مارکیٹ قائم ہوئی ہے ، جہاں ہر قسم کی باندیاں ، خواہ وہ یہودی ہوں یا مسلمان ، عیسائی یا کسی مذہب کی ، نیلام ہوتی ہیں ۔ آرمینیا ، ایران ، آسٹریا اور دوسرے ممالک کی لڑکیاں موجود ہیں ، لوگ آتے ہیں اور انھیں خرید لے جاتے ہیں ، کوئی بیوی بنانے کے لئے ، کوئی لونڈی بنانے کے لئے ۔"

ہم میں سے ایک لڑکی بولی ۔

"نہ جانے یہ بازار کس طرح کا ہوگا ۔"

اولگا نے بتایا

"ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں بہت سے کمرے بنے ہوئے ہیں ، ہر کمرہ میں چند لڑکیاں نمائش کے لئے موجود ہیں "

میں نے کہا ـــــ

"نہ جانے ان بیچاریوں کی قسمت میں کیا لکھا ہے ؟"

اولگا کہنے لگی ؛

"یہ زندگی بھی عجیب زندگی ہوتی ہے ، ادھر ادھر سے جمع کی ہوئی لڑکیوں کو عورت بازار کا مالک خرید کر یا اغوا کر کے لاتا ہے ، پھر انھیں زیور تعلیم و تربیت سے آراستہ کرتا ہے ، اُن کی عزت اور آبرو کی حفاظت کرتا ہے تاکہ ان کی قیمت میں فرق نہ آنے پائے ، پھر عورت بازار میں لاکر انھیں بیچ ڈالتا ہے ، پھر لڑکی کو آواز دے کر باہر بلاتا ہے اور گاہکوں کے سامنے اس سے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے

کو کہتا ہے۔ تاکہ اس کے انداز و ادا کا اندازہ ہو سکے اور گاہک محسوس کرے کہ
یہ لڑکی کتنی خوب صورت ہے۔ اس کے پاؤں کتنے نازک ہیں، پھر وہ لڑکی اپنے
رخساروں کو ایک گیلے کپڑے سے رگڑتی ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس کا آب و
رنگ مصنوعی نہیں قدرتی ہے پھر خریداروں میں سے کوئی شخص اس سے مسکرانے
کی فرمائش کرتا ہے تاکہ اس کے دانتوں کی دیدہ زیبی اور خوبصورتی معلوم کر سکے
اس کے بعد وہ لڑکی اپنے کمرہ میں چلی جاتی۔ مالک اور خریدار میں سودا شروع ہو
جاتا ہے۔"

عزیزی بیچ میں بول پڑی،
"خدا رحم کرے کسی نازک اندام لڑکی کو جب کوئی بھدا اور موٹا یہودی خریدتا
ہے تو میری روح لرز جاتی ہے۔"
اولگا نے اپنے معلومات پیش کرتے ہوئے کہا "مختلف ملکوں اور قوموں
کی تقریباً دو سو لڑکیاں عورت بازار میں برائے فروخت موجود ہیں۔ ان میں ترک
لڑکیاں بھی ہیں جو بہت جلد موٹی اور بھدی ہو جاتی ہیں۔ ان سب کو عورت بازار
کے مالک نے خریدا ہے جو ایک بوڑھا آدمی ہے۔ میرے خیال میں اس کی عمر ستر
سے کم نہ ہوگی اور وہ بھینگا بھی ہے۔
اولگا کی یہ باتیں سنکر ہم سب ہنس پڑے۔ میں نے کہا "پھر تو بڑا مزہ آتا ہوگا
تین لڑکیاں اسے نظر آتی ہوں گی"
میرے اس فقرے پر تمام سہیلیاں پھر ہنس دیں۔
اولگا نے ہنستے ہوئے کہا۔
"وہ عورتوں کا بیوپاری تاجر بڑے مزے کا آدمی ہے موٹی لڑکیوں کو خاص طور
پر چھانٹا کرتا ہے۔ جب انھیں بلائیگا تو خوبصورت یا جانِ من کہہ کر اور ان الفاظ کے

ساتھ ساتھ وہ ایسی اداکاری کرے گا، جیسے واقعی یہ لڑکی اس کی مجبوریوں پر نثار ہے، کبھی کبھی تو شرارت انتہا کو پہنچ جاتی اور ان لڑکیوں کو میری جان، میری روح، میری زندگی کہہ کر مخاطب کرتا“

اورلگا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

میرے سامنے کا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ عورت بازار کی تمام لڑکیاں فروخت ہو گئیں، صرف دو دبلی پتلی لڑکیاں بچ رہیں۔ ان بیچاریوں کی صورت بھی اچھی نہیں تھی، کسی نے ان پر نظر بھی نہ ڈالی۔ یہ رنگ دیکھ کر عورت بازار کا زندہ دل بوڑھا مالک جو موٹی تازی لڑکیاں فروخت کر چکا تھا سامنے آیا، اس نے دو اشرفیاں شرط کی ٹھہرائیں کہ ایک سال کے اندر یہ دونوں لڑکیاں موٹی تازی اور تر و تازہ ہو جائیں گی، نہ ہوں تو رقم واپس“

اورلگا کی یہ بات سن کر ہم پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ ہمارے قہقہے اتنے پرشور تھے کہ ماریگو رزمی نک جو بالکل بہری تھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

(۲۱)

رقاصہ کا کمال

ایک روز قادان یعنی ہماری گورنرس ایک نئی خبر لائی۔ اس نے بتایا کہ سلطان معظم کی تیسری بیوی امید سے ہے اور عنقریب ان کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے۔

اس تقریب کے سلسلہ میں عظیم الشان تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ سلطان معظم کی یہ تیسری بیوی جس کرشک میں رہتی تھیں، وہ نغمہ کدہ بن گیا۔ ہر وقت وہاں باجہ بجتا اور گانا ہوتا رہتا۔ پھل اور پھول بڑی کثرت سے ادھر ادھر رلتے نظر آتے جو لوگ ان کے کمرہ میں جاتے انہیں ہدایت کر دی جاتی کہ صرف خوبصورت چیزوں کے متعلق گفتگو کریں۔

وزیر اعظم، مفتی شہر، بڑے حکام اور عمال، فوج کے اعلیٰ افسران سبھی اس موقع پر جب کہ بچہ پیدا ہونے والا تھا، امید و آرزو کا آرشہ لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ خود سلطان معظم اپنے مصاحبوں اور منصب داروں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اس موقع پر وزیر اعظم اور دوسرے منصب داروں کی حاضری اس لئے ضروری تھی کہ نومولود کو لے کر کسلر آغا جب برآمد ہوتا تو وہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے، ولادت اور جنس کا سرٹیفکیٹ بھی وزیر اعظم ہی کو دینا پڑتا۔ جیسے ہی بچے کی ولادت ہوتی۔ حرم سرا

توپیں دغنے لگتیں، پھر فوراً ہی کسٹم ہاؤس، بحری بیڑے اور دوسرے اہم مقامات سے توپوں کے داغے جانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

اس کے بعد نجومی آتا، وہ ستارے دیکھتا، زائچہ تیار کرتا اور بچّے کے مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرتا۔

زائچہ بڑی احتیاط سے رکھا جاتا اور اسی کے مندرجہ ہدایت کے مطابق تمام مواقع پر عمل کیا جاتا، باہر نکلنے، کسی تقریب میں شریک ہونے، غسل کرنے، کپڑے بدلنے، سواری کرنے اور اس طرح کے تمام کاموں میں زائچہ کی ہدایات پر نظر رکھی جاتی۔ زائچہ میں متعدد رنگوں کا ذکر ہوتا کہ ان کے استعمال سے بدروحیں دور رہیں گی اور نظر بد کا کوئی اثر نہ ہو گا، بیماری قریب نہیں پھٹکنے پائے گی، پھر نجومی کی ہدایت کے مطابق کوئی قیمتی پتھر بھی بچے کو پہنایا جاتا جو اس کی قسمت کے مطابق ہوتا، تاکہ وہ ہمیشہ خوش و خرم، صحت مند اور تومند رہ سکے۔

پھر جوہری اور سنار بلائے جاتے، درزی اور خیاط طلب کئے جاتے اور انہیں حکم دیا جاتا کہ وہ بچے کے لئے ضروری زیورات، سامان آرائش اور کپڑے تیار کریں، یہ کام چیف خواجہ سرا یعنی کسلر آغا کی نگرانی میں انجام پاتا اور خود کسلر آغا وہی کرتا، جو بچے کی ماں اسے حکم دیتی۔

ہم لوگ یہ خوشخبری سننے کے بعد آپس میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ توشہ خانہ کی منتظم آئی اور اس نے کہا۔

"اب آپ لوگ نئے کپڑے پہن لیجئے۔"

ہم نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ فوراً اپنی باندیوں کو حکم دیا۔ وہ آئیں اور انہوں نے ہمیں کپڑے پہنانے شروع کر دیئے، یہ وہی کپڑے تھے جو والدہ سلطان نے ازراہِ کرم گزشتہ اپریل مرحمت فرمائے تھے۔

رات کو بڑی دھوم دھام سے دعوت ہوئی۔ بدقسمتی سے لڑکی پیدا ہوئی تھی، اگر کہیں لڑکا پیدا ہوتا تو اس دعوت کا رنگ اور اہتمام اور ہی ہوتا، پھر بھی دھوم دھام اور تزک و احتشام کا جہاں تک تعلق تھا کوئی بات اٹھا نہیں رہی تھی۔ اس موقع پر والدۂ سلطان نے مختلف قسم کے قیمتی زیورات بھی ہمیں مرحمت فرمائے۔ مجھے ان کی بارگاہ سے جو کچھ مرحمت ہوا وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بھی تھا اور قیمتی بھی، موتیوں کے دو ہار، دو زمرد کے طلائی بندے، جن میں ہیرے جڑے ہوئے تھے اور جو بے انتہا خوبصورت تھے، سونے کا جڑاؤ نکلس بیزا ایڑی کے سلیپروں کا ایک جوڑا جن پر جواہرات کی بچی کاری کی ہوئی تھی اور جن کی سلائی سونے کی تاروں سے ہوئی تھی۔

جس اہتمام اور تکلف کے ساتھ ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا وہ سلطان معظم کے بالکل شایان شان تھا۔ سب کے سامنے سونے کی پلیٹوں میں کھانا رکھا گیا۔ کھانے کے ساتھ جو میٹھی چیزیں تھیں وہ بھی رنگا رنگ اور مختلف انواع و اقسام کی تھیں، ریوند کی طشتریوں میں پیش کی گئیں۔ انجیر، بادام خروٹ ان چیزوں کو بالائی کی تہ میں جما کر، گلاب کے عرق میں بسا کر بے انتہا لذیذ بنا دیا گیا تھا، انگور کے خوشے ساری میز پر پھیلے ہوئے تھے۔ دیواروں پر اور ستونوں پر تازہ پھول اس خوبصورتی سے لگائے گئے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہ کوئی کمرہ نہیں، چمنستان ہے اور وہ بھی عین موسم بہار کا۔ سارا کمرہ کھانے کی اور پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

آج کے مجمع میں خوبصورت اور طرح دار نازک اندام اور سحر طراز، سیاہ رنگ اور لالہ فام، مختلف ملکوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں، شاندار لباس میں بیش قیمت جواہرات سے آراستہ میزوں کے ارد گرد بیٹھی عجب بہار دکھا رہی تھیں۔ جنبش کے ساتھ جواہرات کی کرنیں اس طرح چمکتیں، کہ آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں۔

دعوت کے اختتام پر نغمہ و موسیقی کے شور میں رقص کا دور شروع ہوا جس نے حاضرین پر عجیب کیفیت طاری کر دی۔ ہر شخص انگشت بدنداں تھا۔

یہ ناچنے والی لڑکیاں زیادہ تر ترک تھیں، ان کا رقص دیکھ کر دیکھنے والے عش عش کر اٹھے۔ بدن پر انہیں اتنا قابو تھا کہ جیسے ان کے جسم میں ایک ہڈی بھی نہیں ہے جب اور جہاں سے چاہیں موڑ لیں۔

رقص کے ہر دور کے بعد یہ لڑکیاں دوسرے کمرہ میں چلی جاتیں، وہاں سے نیا لباس تبدیل کرکے پھر نمودار ہوتیں اور از سرِ نو ناچنا شروع کر دیتیں۔

عزیزی میرے پاس بیٹھی تھی، اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

"آج کی رات کتنی ٹھنڈی، کتنی سہانی، کتنی خوبصورت اور کتنی دلچسپ ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اپنے وطن میں بیٹھے ہیں۔"

عزیزی کی ان باتوں سے میں بہت متاثر ہوئی، میرا جی چاہا کہ اس موضوع پر اس سے باتیں کروں اور بہت دیر تک یاد وطن کرتی رہوں۔ اتنے میں ہماری گورنس نے ہم سے کہا۔

"وقت ہو گیا، چلو اب سو رہو۔"

سب سے پہلے ہم نے غسل کیا شب خوابی کے کپڑے پہنے، پھر بستر پر جا کر دراز ہو گئے، جس پانی سے ہم نہاتے تھے وہ عرق گلاب ہوتا تھا جس سے ہمارا سارا بدن مہک اٹھتا تھا، چار باندیاں مساج کے لئے موجود رہتی تھیں، پہلے وہ تیل سے مساج کرتیں پھر نرم تولیے سے بدن رگڑنے کے بعد غسل کراتیں۔

— واقعہ یہ ہے کہ مساج کے فن میں انہیں کمال حاصل تھا، بدن کے داغ دھبے یہ اس طرح دور کر دیتیں کہ پھر ان کا نام نشان تک باقی نہیں رہتا تھا جب کبھی ہم پر تھکان کی کیفیت طاری ہوتی یا درد سر کی شکائیت ہوتی تو یہ مساج کرنے

والیاں طلب کرلی جاتیں اور اپنی دستکاری سے چند لمحوں کے مساج کے بعد درد اور تکان دونوں کو اس طرح غائب کر دیتیں جیسے تھا ہی نہیں۔

یہ مساج کرنے والیاں اپنے ساتھ آرائش کی کچھ اور چیزیں بھی رکھتی تھیں، خاص طور پر حنا تو ہر وقت ان کے پاس موجود رہتی، جسے ہم اپنی ہتھیلیوں پر، ناخنوں پر اور تلووں پر لگانے کے عادی ہو گئے تھے۔

محل سرامیں غازہ، تیل، عطر اور دوسری خوشبویات جو تیار کی جاتی تھیں، ان میں ہنر کا اتنا کمال صرف کیا جاتا کہ واقعی ان سے بہتر چیزوں کا تیار ہونا ممکن نہ تھا۔ سلطان معظم کی دوسری بیوی کو آرنج سینٹ پسند تھا، یہ اتنا عمدہ تیار ہوتا تھا کہ گھنٹوں اور پہروں اس کی خوشبو قائم رہتی تھی۔ اسی طرح ہونٹوں کو سرخ کرنے اور رخسار کا رنگ چوکھا کرنے کے لئے بھی محل سرا کا محکمہ افزائش حسن ایسی چیزیں تیار رکھتا تھا جو نقل کو اصل بنا دیتی تھیں۔ اس محکمہ کا تیار کردہ کاجل بھی ایک عجیب چیز تھا۔

آرنج سینٹ چونکہ سلطان معظم کی دوسری بیوی کے لئے خاص اہتمام سے بنتا تھا، اس لئے صرف وہی استعمال کرسکتی تھیں۔ کسی اور کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

سلطان معظم کی سب سے زیادہ پسندیدہ بیوی وہ تھی جن کے بطن سے سلطان کا پہلا لڑکا تولد ہوا تھا۔ محکمہ افزائش حسن ان کی فرمائش کے مطابق جو چیزیں تیار کرتا تھا انہیں کوئی دوسرا نہیں استعمال کرسکتا تھا۔

سلطان معظم کی تیسری بیوی کو قدرت نے دولت حسن سے بہت زیادہ مالا مال کیا تھا۔ یہ تیسری بیوی پہلے ایک باندی تھی۔ — ان کا ناچ اور گانا دیکھ کر سلطان معظم بہت متاثر ہوئے۔ پھر ان کی سحر طراز شخصیت، دل موہ لینے والی صورت اور

قتل کر دینے والی ادائیں بھی کام آئیں، اور سلطان ان کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے سلطان نے فوراً ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا اور بہت جلد وہ اس قابل ہو گئیں کو سلطان کے حبالۂ عقد میں باقاعدہ آ سکیں، سلطان انہیں بہت زیادہ چاہتے تھے، یہ سلطان کی بیوی بھی تھیں اور محبوبہ بھی۔

کسرا آغا کو ہر وقت یہی دھن لگی رہتی کہ ہم میں سے ہر ایک وہ تمام طور طریقے سیکھ لیں جن کا سیکھنا ہم سب کے لئے ضروری ہے۔

ایک روز ان پابندیوں سے اکتا کر او لگا نے کسرا آغا سے کہا۔

"آپ کی باتوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب کو کسی نہ کسی دن سلطان کی بیوی بننا ہے حالانکہ ہماری طرح آپ بھی جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے"

کسرا آغا نے جواب دیا ——!

"تم نادان ہو، میں ایسی عورتوں کو جانتا ہوں جو سلطان کی نگاہ میں محبوبہ قرار پائیں اور ان کی قوت و طاقت اور اقتدار و اختیار پچاس بیویوں سے بھی زیادہ تھا ——"

رفتہ رفتہ محل سرا کے قواعد و ضوابط آداب و تکلفات، اصول اور طور طریقے سے میں مانوس ہو گئی، کسرا آغا بھی اب میرے لئے اجنبی آدمی نہ رہا، لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی یہ بات میں فراموش نہ کر سکی کہ یہی وہ شخص ہے جس کے آدمیوں نے مجھے خریدا، اور خرید کر یہاں لائے اور مجھے ہر طرح اپنا مطیع و منقاد بنا لیا۔ کسرا آغا کی شخصیت کافی بھاری بھرکم تھی، وہ چہرے سے ایک افسر ہی معلوم ہوتا تھا، اس کا بلند و بالا قد، اونچے مونڈھے، تنی ہوئی گردن، اسے سب سے ممتاز بنا دیتے تھے اور اپنا بھاری بھرکم اور ڈھیلا ڈھالا لباس پہننے کے بعد وہ سب سے اونچا نظر آنے لگتے۔

کسرا آغا جب گشت کو نکلتا تو اس کا ٹھاٹھ دیکھنے کے قابل ہوتا۔ چار حبشی نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ساتھ ساتھ چلتے، یہ منظر

ایسا وحشت انگیز ہوتا کہ جو دیکھتا سہم جاتا۔

کسرا آغا کو پریشان کرنے میں ہمیں لطف آتا مختلف طریقوں سے ہم اُسے پریشان کیا کرتے۔ کبھی بیمار بن جاتے کبھی اسے جھوٹی سچی باتیں سنا کر مضطرب کر دیتے، کبھی کسی لڑکی کے بارے میں کہہ دیتے، یہ بھاگنے والی ہے اس کا خیال رکھنا وہ بھی ہماری ان حرکتوں کو سمجھ گیا تھا انتقام لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا کبھی ہمیں بدصورتی کا طعنہ دیتا، کبھی ہمارا کیا ہوا کام غلط طور پر تقسیم کر دیتا جس کا عتاب ہم پر نازل ہوتا جب وہ ہم میں سے کسی کو بدصورتی کا طعنہ دیتا تو وہ دوڑی دوڑی جاتی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ اور اپنا سراپا دیکھ کر اندازہ کرتی، کیا واقعی اس کی خوبصورتی بدصورتی سے بدل گئی ہے؟ اس منظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کسرا آغا ایک زوردار قہقہہ لگاتا اور جب جھلا کر وہ لڑکی مڑتی تو یہ حضرت چمپت ہو چکے ہوتے۔

ایسا بھی ہوتا کہ ہم کسی گوشے میں چھپ جاتے، وہ ہمیں پوچھتا تو کوئی لڑکی کہہ دیتی کہ میں نے تو اسے گھنٹوں سے نہیں دیکھا ہے کہیں بھاگ تو نہیں گئی؟ ذرا تلاش کر لو

پھر ہم اپنے گوشے سے نکل آتے اور خوب اس کے بنائے جانے پر ہنستے اور اس کی خوشامد کرنے کہ ذرا خاسفورس کی سیر ہمیں کرا دے بات یہ ہے کہ کسرا آغا کو زیادہ چھیڑنا بھی زیادہ ممکن نہ تھا۔ وہ بہت بڑی شخصیت کا مالک اور اس کے اختیارات بہت وسیع تھے۔

(۲۲)

قسمت

بے شک حرم سرا کی دلچسپیوں اور رنگینیوں سے میں مانوس ہو گئی تھی، وقت کا بڑا حصّہ آپس کی باتوں اور خوش آئند پروگراموں میں صرف ہوتا تھا، دن ہو یا رات تنہائی ہو یا مجمع، والدۂ سلطان کا دربار ہو یا آپس کی سوسائٹی، کالے خواجہ سرا کی باتیں ہوں یا کِسلر آغا کی شرارتیں اور بذلہ سنجیاں ہوں، یا ڈرک جھونک اور چھیڑ چھاڑ ——— ان سب چیزوں میں میرا حصّہ تھا، ان سب باتوں سے مجھے دلچسپی ہوتی تھی، یہ پتہ بھی نہیں چلنے پاتا تھا کہ دن کب آیا، چاند کب نکلا اور رات کی تاریکی کب مسلط ہوئی، صبح جاگنے کے وقت سے لے کر رات کو سونے کے وقت تک سارا دن تفریحوں، دلچسپیوں اور رنگا رنگیوں میں صرف ہوتا تھا، یہاں جو عیش و تنعم کی زندگی حاصل تھی، وہ کہیں اور کب مل سکتی تھی؟ یہاں جو کھانا ملتا تھا، جو لباس ہم پہنتے تھے، جو زیورات ہمیں عطا ہوئے تھے، ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتے تھے،

لیکن ان سب دلچسپیوں اور رنگا رنگیوں کے باوجود میرا کیا حال تھا؟

کیا میں خوش تھی ؟

کیا میں آسودہ اور مطمئن تھی ؟

کیا اپنا ماضی میں نے فراموش کر دیا تھا،

کیا یہاں آکر، یہاں کی زندگی سے مانوس ہو کے میں سب کچھ بھول گئی تھی؟

دوسروں کے بارے میں، تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی، لیکن اپنے بارے میں ———— اور خود مجھ سے زیادہ میرا حال کون جان سکتا ہے؟ ———— کہہ سکتی ہوں کہ جب کبھی تنہائی میسر آتی، خواہ وہ صحن باغ ہو یا کمرا کا گوشہ، مجھے پرانا زمانہ ضرور یاد آتا جو میرے ماضی کا سب سے زیادہ خوشگوار اور میری زندگی کا سب سے زیادہ ناقابلِ فراموش حصّہ تھا،

وہ زمانہ جب میرے والد بھی زندہ تھے اور ان کے رعب و دہشت کا یہ عالم تھا کہ کوئی طاقت ور سے طاقتور حریف بھی ہمارے قبیلہ یا ہماری حویلی پر حملہ کرنے کا ارادہ نہیں کر سکتا تھا، ————!

وہ زمانہ بھی میری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتا تھا، جب میں اور میری بہن اور ہمارے چچا زاد، خالہ زاد، ماموں زاد بھائی اور بہنیں، سب کسی تقریب کے موقع پر جمع ہوتے، باتیں ہوتیں، کہانیوں کا سلسلہ شروع ہوتا، جھوٹ اور سچ کے طومار کھڑے کئے جاتے، اور پھر ———— پھر میں اور بہن مل کر گاتے، اور یہ رشتہ دار، بجاتے، اس طرح کے اجتماعات بالعموم اس وقت ہوتے جب فصل کٹنے کا زمانہ ہوتا اور خوشگوار موسم میں سلامتی کے ساتھ فصل کاٹ لی جا چکتی، جب کبھی پھلوں کی فصل اچھی ہوتی اور ہم لوگ خوب نفع کماتے،

یہ باتیں یاد کرتے کرتے اور بھی بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آجاتیں، جار جیا کہ پہاڑیاں یاد آتیں - جن کے دامن میں خوشی تھی، اطمینان تھا

آسودگی تھی اور زندگی کی امنگ تھی،

ہمارے دیہات اور قبائل کی پیاری، وفادار اور کارگذار عورتیں گھروں میں بیٹھ کر آٹا گوندھتیں، روٹی پکاتیں اور گاتی جاتیں،

وہ مہمانوں کا تانتا؛

جب دیکھو جب مہمان چلے آ رہے ہیں، تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ ان کا استقبال ہو رہا ہے، ان کے آتے ہی گھر میں ایک عجیب طرح کی رونق اور گھما گہمی ہنسی، الغرض قہقہوں اور چہچہوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا،

وہ بے فکری کا دور،

وہ وطن کی صبح شام، وہ اہلِ قبائل کی سادہ زندگی، وہ وفاداری وہ جوش وخروش

وہ باہمی اجتماعات، !

اور پھر ایک دن؛

آہ وہ دن کس طرح بھلایا جا سکتا ہے، جب میرا پیارا باپ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

والد کا انتقال صرف ہم بدبختوں ہی کے لئے نہیں سارے قبیلہ والوں کے لئے پیام ماتم ثابت ہوا، اسی دن سے ہماری طاقت ٹوٹی ہمارا حوصلہ کمزور ہوا، اور ہماری ساکھ جاتی رہی،

اللہ ——

وہ زندگی کو ہمیشہ کے لئے غمگین بنا دینے والا حادثہ،

میری ماں —— جسے دنیا میں سب سے زیادہ میں چاہتی تھی،

—— کا رہزنوں اور ڈاکوؤں کے حملہ سے دہشت زدہ ہو کر مرنا

—— آہ، وہ دن وہ واقعہ، وہ منظر جب یاد آتا تو کلیجہ منہ

کر آنے لگتا۔

پھر والدہ کی بہت سی باتیں یاد آنے لگتیں،

خاص طور پر انکی وہ بات جب بہن کی شادی کے موقع پر انہوں نے میرا زرق برق لباس اور حسن و جمال دیکھ کر بے ساختہ کہی۔

"خدا نظر بد سے بچائے، یہ حسن یہ نکھار دیکھ کر سلطانہ بھی آپ جل جائے گی"

اُن کی پیشگوئی حرف بہ حرف پوری نظر آ رہی تھی،

والدہ کے منہ سے جب یہ الفاظ نکلے تھے، تو ان کے یا میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ میں کبھی وطن سے نکل کر زمانہ کی ٹھوکریں کھاتی، سلطان معظم کی حرم سرا میں پہنچوں گی ——————

لیکن کیا واقعہ نہیں ہے کہ اب میں قسطنطنیہ میں ہوں، حرم سرا میں ٹھاٹھ دار شان کی زندگی بسر کر رہی ہوں، والدۂ سلطان کی عنایت اور محبت سے بہرہ ور ہوں کسرا آغا کی آنکھیں اگر پڑھ سکتی ہوں تو شاید وہ دن دور نہیں، جب میں واقعی ایک دن سلطانہ بھی بن جاؤں گی،!

ہاں خوب یاد آیا،،

لولا کی پیشین گوئی بھی تو یہی تھی، اس نے بھی تو مجھے اس طرح کی بشارت دی ہے۔

اہل جارجیا میں ایک مثل مشہور ہے کہ آدمی کی قسمت کا حال اس کی پیشانی میں مرقوم ہوتا ہے۔

میری قسمت کا حال، والدہ نے بھی پڑھ لیا کسرا آغا نے بھی اور لولا نے بھی ——————— دیکھا چاہیئے اب پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے!

—— بہر حال زندگی کا قافلہ سبک روی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف

—— جو ابھی تک نامعلوم ہے، لیکن جس کے آثار ظاہر ہوتے جارہے ہیں۔ رواں ہے —— انسان قسمت کے سامنے بالکل بے بس ہے —— وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے!

---

(۲۳)

محلسرا کی زِندگی

پہلے پہل جب میں حرم سرا میں داخل ہوئی تو یہاں کے تمام شعبوں اور متعلقہ محکموں، مثلاً حمام، ڈائننگ ہال، آرام کدہ، خواب گاہ، جامہ خانہ، مطبخ، خزانہ، توشہ خانہ اور باغیچوں وغیرہ سے متعلق مجھے ضروری معلومات بہم پہنچائے گئے۔

چونکہ مجھے سینے پرونے اور کشیدہ کاری کے کام سے زیادہ دلچسپی تھی، لہٰذا میں زینت و آرائش کے شعبہ سے وابستہ کر دی گئی، اس شعبہ میں تقریباً دو درجن لڑکیاں تھیں جو میری طرح خرید کر حرم سلطانی کے لئے لائی گئی تھیں، اس شعبہ کی دوسری تمام لڑکیوں کے ساتھ مجھے بھی مل کر کام کرنا پڑتا تھا، ریشم کے کپڑوں پر سونے کے دھاگے سے جواہرات کا ٹانکنا میرا کام تھا، نیز وہ ملبوسات بھی میں تیار کرتی تھی، جن کے احکام وقتاً فوقتاً قادن (حبیبۂ گورنس) یا سلطان کی بیویوں کی طرف سے صادر ہوتے رہتے تھے،

جب یہاں کا کام قابلِ اطمینان طریقہ پر میں انجام دینے لگی تو مجھے ترقی ملی اور میں محکمہ افزائش جمال میں منتقل کر دی گئی، میری جو ساتھی لڑکیاں اپنے کام میں

چست نہ ثابت ہوئیں وہ بدستور سابق محکمہ میں رہیں اور "ترقی" سے محروم کر دی گئیں

اس شعبہ میں میرے ساتھ پچاس اور لڑکیاں کام کرتی تھیں، ان میں عزیزی بھی تھی، اس کی میری رفاقت اب تک نبھ رہی تھی، اور اس کی مجھے بیحد خوشی تھی، اس شعبہ میں آنے کے بعد خوشبویات کی تیاری اور اہتمام کا بار میرے اوپر ڈال دیا گیا،

میری بہت سی دشواریاں عزیزی کی رفاقت اور تعاون کی بدولت آسان ہو گئیں، وہ ہر وقت سایہ کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی، اور بڑے خلوص سے ہر معاملہ میں میرا ہاتھ بٹاتی، اس کا برتاؤ میرے ساتھ کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ مجھے بہت کچھ سمجھتی ہے، حالانکہ میں اس کی ہم وطن تھی اور اس حیثیت سے اسے بالکل مساویانہ بنیاد پر مجھ سے ملنے، اور برتاؤ کرنے کا حق تھا،

عزیزی کشیدہ قامت تھی، اس کے لمبے لمبے بال بڑے خوبصورت تھے، بڑی بڑی کٹورہ کی سی آنکھیں، رنگ سنہری مائل، کپڑے پہننے کا بھی اسے بڑا سلیقہ تھا اور لباس کی تراش خراش کے فن میں تو وہ ماہر تھی، وہ تھی بھی خوبصورت، لیکن اپنے مخصوص لباس میں تو اس کی خوبصورتی، قیامت بن جاتی، اس کی قمیص کافی نیچی ہوتی تھی، جو سامنے سے کھلی ہوتی تاکہ سرخ مخمل کی صدری بھی نمایاں رہے کبھی وہ شلوار پہنتی، کبھی پاجامہ، لیکن جو کچھ بھی پہنتی وہ اس پر اس طرح سجتا، جیسے اسی کیلئے اسکی تخلیق ہوئی تھی، سنہرے رنگ کے سلیپر جو سامنے کی طرف سے مڑے ہوئے تھے اسکی صدری کے رنگ سے بالکل مشابہ تھے، موتیوں کے کئی ہار اسکی گردن کی زینت بنے رہتے تھے،

عزیزی بڑی خوبصورت لڑکی تھی، اسی خوبصورت تھی اگر اسے پرستان میں کھڑا کر دیا جاتا تو بھی اس کی رعنائی اور زیبائی خراج تحسین وصول کر کے رہتی، مجھ سے وہ ہمیشہ مادری زبان میں گفتگو کرتی، اور جب بات کرنے پر آتی تو پھر اس

کی زبان رکھنے کا نام نہ لیتی، طرح طرح کے سوالات اس کے ذہن میں اُبھرتے اور یہ ساری باتیں بڑی سادگی سے وہ پُوچھ ڈالتی، باہر کی دُنیا کے بارے میں وہ بہت متجسس رہتی تھی، مجھ سے زیادہ تر اس قسم کے سوالات کرتی تھی، کیونکہ کئی سال سے وہ حرم سرا میں بند تھی، اس دنیا کے سوا باہر کی دُنیا کا حال اسے بالکل معلوم نہیں تھا،

ایک روز، جب ہم سب بیٹھے اپنے اپنے کام میں مشغول تھے، اس نے کہا، "میرا دل اب تک جار جیا میں ہے، لاکھ بھلانا چاہتی ہوں، مگر وہاں کے صبح و شام، وہاں کی وادی، میدان پہاڑ سب مجھے اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔"

نئے شعبہ میں آنے کے بعد ہماری باندیوں کی تعداد بھی دوگنی ہو گئی، یہ پہلی باندیوں کے مقابلہ میں زیادہ مستعدی کے ساتھ ہماری خدمت کرتی تھیں، اور اس کی منتظر رہتی تھیں کہ ہم خوشنودی کے دو چار الفاظ ان کی حوصلہ افزائی کے لئے کہہ دیں، بات یہ ہے کہ "ترقی" کے ساتھ ساتھ ہمارا مرتبہ اور درجہ بھی بڑھ گیا تھا۔

ان باندیوں کے علاوہ چند خادم اور غلام بھی ہمیں تفویض کئے گئے ان کا کام یہ تھا کہ حکام بالا کے احکام و ہدایات ہمارے پاس لائیں، ہمارے معروضات جہاں ہم بھیجیں وہاں پہنچا دیں، بازار سے جو سودا سلف منگانا ہو تا وہ بھی ان ہی سے منگایا جاتا، یہ بھی اپنے فرائض بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے انجام دیتے تھے

ہفتہ میں تین مرتبہ ہمیں ایک خاص کلاس میں حاضری دینا پڑتی، دربار سلطانی میں جب کبھی حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہو تو وہاں کس طرح ہمیں جانا چاہیئے، اور وہاں کے دوران قیام میں کون کون سے آداب و تکلفات ا

قواعد و ضوابط پر عمل کرنا چاہیئے؛ اس کلاس میں صرف ایک گھنٹہ ایک دن سے زیادہ گراں اور تکلیف دہ ثابت ہوتا تھا، ہم میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس عرصہ میں کسی طرح کی بات چیت کر سکے یا کسی سے آنکھ ملا سکے، یا کسی طرح کے اشارے کر سکے ——————— اگر کہیں یہ مصیبت روزانہ بھگتنا ہوتی، تو نہ جانے ہم پر کیا گزرتی، وہ تو خدا کا شکر ہے کہ ہفتہ میں صرف تین ہی بار اس آفت سے سامنا ہوتا تھا۔

تاون ہماری ہر نقل و حرکت پر نگرانی رکھتی، اور کوئی بات اگر خلاف آداب ہم سے سرزد ہو جاتی تو پھر اس کے عتاب سے محفوظ رہنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا، اس نے جو تعلیم دی تھی اس کے مطابق زور سے یا قہقہہ لگا کر ہنسنا ممنوع تھا، کس طرح کھڑا ہونا چاہیئے؛ کس طرح بندِ نقاب کھولنا چاہیئے؛ کس طرح زیر نقاب ہونا چاہیئے؛ اگر دور سے کوئی اجنبی آدمی آتا ہوا نظر آئے تو ہمیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے؛ اور اس طرح کے بہت سے آداب تھے جو تاون نے ہمیں ازبر کرا رکھے تھے بار بار ہمارا امتحان لے کر اور ہماری جانچ کر کے وہ اپنی تسلی کرتی تھی اور اگر کہیں خامی پاتی، یا کوئی نقص نظر آتا، فوراً ٹوکتی اور از سرِ نو تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کر دیتی، اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ ہم میں سے ہر ایک کو وہ آداب و تکلفات کے فن میں ماہر بنا دے اور کوئی شبہ نہیں اس کی محنت رائگاں نہیں گئی، جس مستعدی سے وہ اپنے فرائض ادا کرتی تھی، اسی توجہ اور انہماک سے ہم اس کے بتائے ہوئے "نسخہ" پر عمل کرتے تھے ——————— !"

(۲۴)

ایک پاشا کی محلسرا

ایک روز قادن نے ہم سے کہا۔
"ایک امیر کبیر پاشا کے ہاں آج ہمیں چلنا ہے، کیوں لڑکیو! چلو گی؟"
میں نے کہا۔
"چلیں گے ــــــــــ لیکن کیوں چلیں گے؟ یہ آپ بتائیے"
قادن بیچاری نیک عورت تھی، وہ ہماری چھیڑ خانیوں کو خاموشی سے برداشت
کرلیتی تھی، اس نے کہا۔
"آج پاشا کی دختر بلند اختر کی شادی ہے"
یہ سن کر ہم سب لڑکیوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی، کچھ اس لئے کہ ایک
کبیر گھرانے کے ڈھنگ اور طریقے دیکھنے میں آئیں گے، کچھ اس لئے کہ ذرا محل سرا کے
باہر نکلنے کا موقع ملے گا۔ زیادہ اس لئے کہ ذرا دیکھیں ان امیر گھرانوں میں لڑکیاں کس
ہیں. کس طرح ان کی شادی ہوتی ہے، کیسے ان کے رسم ورواج ہیں؟ ہم سب نے قادن سے
"تو پھر چلیئے ــــــــــ!"

قادن نے ہماری بے قراری محسوس کر لی اور گو یا ہوئی :"

"ابھی چلتے ہیں ــــــــــــــــــ!"

ہم سب نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ایسے نادر موقعے روز روز نہیں ملتے۔ آج کی اس مبارک تقریب سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئیے۔ بیچاری قادن کو ہمیں نظم و ضبط رکھنے میں بڑی دشواری پیش آتی۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ ایٹی کیٹ کے لحاظ سے وہ چاہتی تھی کہ ہم خاموش رہیں لیکن ہمارا ذوقِ تکلم کسی طرح خاموش رہنے پر آمادہ نہ تھا' بہرحال جلدی جلدی ہم نے لباس تبدیل کیا' باندیاں آئیں انہوں نے ہمیں لباس پہنایا' اور ہم جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن قادن نے حرکت نہ کی' اس کا یہ سکوت ہمیں کھل گیا' اور ہم نے اس طرح آپس میں سرگوشیاں کیں جیسے بلبلے پھوٹ رہے ہوں۔ قادن نے پکارا ــــــــ

"صبر! ــــــــــــ صبر! اگر تمہاری بے صبری کا یہی حال ہے تو بہتر یہ ہے کہ چلنے کا ارادہ ترک کر دو۔ کیونکہ بہر حال نظم و ضبط کی پابند رہ کر ہی تم جا سکتی ہو۔"

ہماری ایک سہیلی نے کہا۔

"آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر' جو کہیئے گا وہی کریں گے۔"

ایک اور سہیلی بولی۔

"لیکن خدا کے لئے اٹھیے بھی تو سہی' آخر ہم کب چلیں گے؟"

قادن نے جواب دیا۔

"جب تک تم لوگ خاموش نہیں ہو جاتیں اس وقت تک چلنے کا ارادہ بے کار ہے۔"

قادن کے منہ سے جیسے ہی یہ الفاظ نکلے' سناٹا چھا گیا۔ معلوم ہوتا تھا ہم میں سے کوئی بولنا جانتا ہی نہیں۔

ہمارے اس مصنوعی سکوت سے قادن بہت خوش ہوئی' اس نے ہم سے کہا۔

"ٹھیک ہے اب ہمیں چلنا چاہیئے! جاؤ خواجہ سرا سے کہدو کہ دروازہ کھول دے،
ملاحوں سے کہو تیار ہو جائیں"

ذرا دیر میں خواجہ سرا برآمد ہوا، ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی، اس کے ساتھ ساتھ
ہم لوگ کاریڈور میں پہنچے، راستے بھر خواجہ سرا کے ہاتھ میں ننگی تلوار چمکتی رہی کاریڈور کا
طویل راستہ طے کرنے کے بعد ہم دروازے پر پہنچے، پھر سیڑھیاں اتر کر کشتیوں میں بیٹھ گئے
ہم سب کی تعداد پچاس کے قریب تھی، کشتیوں میں نہایت آرام دہ گدّے لگے ہوئے تھے
کل پانچ کشتیاں تھیں، ہر کشتی پر دس لڑکیاں اور دو خواجہ سرا نگران کی حیثیت سے۔

کشتیاں چلنے لگیں، چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے جھنڈ ہمارے آگے اور پیچھے چہچہاتے ہوئے
اڑنے لگے یہ وہی چڑیاں تھیں جن کے بارے میں مشہور تھا کہ حرم سرا کی مرحوم خواتین کی روحیں
ہیں۔

باسفورس کی لہروں پر ہماری کشتی اچھلتی کودتی رواں دواں تھی۔ چڑیاں ہمارے اوپر
پرواز کر رہی تھیں، بچے ساحل پر کھیل رہے تھے۔ آس پاس کے درختوں سے پھولوں کی بھینی بھینی
خوشبو آ رہی تھی، میرے دل میں خوشی کی لہریں اٹھ رہی تھیں، ظاہری طور پر یہی لیکن اس زندگی
میں آزادی تھی، کہاں حرم سرا کی پابندیاں، کہاں کشتیوں پر یہ آزادانہ سیر۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم پاشا کے گھر پر پہنچے مہمانوں کی کثرت کا یہ عالم تھا
سارے باغ میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، ہم ابھی کشتیوں پر سے اترے نہیں تھے کہ خواجہ سرا
نے چیخ کر ہمارے استقبال پر موادات کی ہدایت دی۔ کنارے پر جو ملازم کھڑے تھے
نے خواجہ سراؤں کے الفاظ دہرا کر آگے تک پہنچائے، ہم جیسے ہی کشتیوں سے اترے
لئے راستہ صاف ہو چکا تھا۔ ہمارے کانوں میں اب تک مہمانوں، میزبانوں اور
ملازموں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

قصرِ سلطانی سے سواریاں آگئیں۔

محو ہو جاؤ انہیں راستہ دو ۔ ـــــــــــــــــــــــ"

جیسے ہی کشتیوں سے اتر کر ہم نے سیڑھیوں پر قدم رکھا، مرحبا اور خوش آمدید کے نعروں سے فضا گونج اٹھی ۔

جب تک پاشا کے محل سرا میں ہم لوگ داخل نہ ہو گئے ہمارے پردہ گوش سے یہ آوازیں برابر ٹکراتی رہیں، ہم ہاتھوں ہاتھ لئے گئے اور فوراً ہمیں استقبالیہ کمرے میں پہنچا دیا گیا فوراً ہی پاشا کی بیوی ہمارے سامنے آئی، اس نے بھی مرحبا اور خیر مقدم کے الفاظ دہرائے، اور ہم میں سے ہر ایک کا استقبال فرداً فرداً گرمجوشی اور تپاک کے ساتھ کیا، استقبال کی صورت یہ تھی کہ اس نے انگلیوں کے سروں سے اپنے ہونٹ، دل اور ابروؤں کو چھو لیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ سب چیزیں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں ۔

یہاں صرف عورتیں ہی عورتیں تھیں لہٰذا بے جھجک ہم لے اپنے نقاب الٹ دئے ۔ لبادہ اتار پھینکا اور یہ دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ ان معزز، دولت مند اور امیر کبیر خواتین کے مقابلہ میں ہمارا لباس کہیں بیش قیمت اور ہمارے زیورات کہیں زیادہ بیش قیمت تھے ۔

پاشا کی اہلیہ محترمہ نے جو ہماری میزبان تھیں بہت عاجزی کے ساتھ معذرت کی کہ ان کا گھر اور فرنیچر اس قابل نہ تھا کہ ہم اسے نوازتے، لیکن یہ صرف انکسار تھا ورنہ واقعہ یہ تھا کہ گھر بھی نہایت شاندار تھا، فرنیچر بھی نہایت قیمتی اور سامان آرائش بھی نہایت لاجواب ۔

میں نے اپنی اور اپنی سہیلیوں کی طرف سے کہا ۔

"تمنے شاندار گھر میں قدم رکھنا ہمارے لئے باعث فخر ہے ۔ آپ اس قسم کا انکسار کر کے ہمیں شرمندہ نہ کیجئے ۔"

جواب میں پاشا کی اہلیہ نے کہا ۔

"آپ نے جو عزت افزائی فرمائی ہے اس کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں"

ملحقہ کمرے میں سازندے اپنے ساز لئے بیٹھے تھے۔ ہماری قادن نے مٹھی بھر کر اشرفیاں ادھر پھینکیں، یہ اشرفیاں انہوں نے اٹھا کر ماتھے سے لگائیں، یہ منظر دیکھ کر بے تحاشہ ہمیں ہنسی آگئی۔ ہنستے ہنستے قادن پر نظر پڑی تو وہ گھور رہی تھی، ہم سب اس طرح چپ ہو گئے جیسے کوئی اور ہنس رہا تھا۔

پاشا کی بیوی ہمیں لے کر ایک اور کمرے میں پہنچی، یہاں دلہن کا جہیز تیار رکھا تھا، کیا کچھ نہ تھا، ہیرے، جواہرات، ریشمی ملبوسات، نقرئی اور طلائی زیورات، نادر قالین، بیش قیمت پارچہ جات، ——

پاشا کی بیوی نے کہا۔

"یہ وہ تحائف ہیں جو ہمارے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں نے ہماری دلہن کو دیئے ہیں۔"

ہماری قادن نے باندیوں کی طرف اشارہ کیا جو خوان میں بہت سے سربند پیکٹ لئے کھڑی تھیں، قادن نے یہ چیزیں پاشے کی اہلیہ کو عطا کیں، وہ ایک ایک چیز کھولتی جاتی تھی اور بیتاب و بے قرار ہو کر تحسین و ستائش کے الفاظ استعمال کرتی جاتی تھی۔

ان سب چیزوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد وفورِ جذبات سے پاشا کی بیوی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ان سب نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شاہی تحفہ —— میری لڑکی ہمیشہ اس لطف و کرم کو یاد رکھے گی"

اب میں ضبط نہ کر سکی۔ میں نے کہا۔

"لیکن دلہن کہاں ہے؟ ہم تو اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

وہ آمادگی اور مستعدی سے بولی

"آئیے! تشریف لائیے ——!"

پاشا کی بیوی ہمیں لے کر وسیع اور کشادہ اور نہایت آراستہ پیراستہ کمرے میں لے گئی، وہاں داخل ہو کر ہم نے دیکھا کہ ایک نوعمر لڑکی نقاب اور برقعے میں لپٹی ہوئی گڑیا کی طرح بیٹھی ہے۔

یہ دلہن تھی۔

میں نے دلہن کو دیکھنے کے بعد کہا

"ماشاءاللہ ———"

مطلب یہ کہ خدا اسے نظرِ بد سے دُور رکھے۔

لڑکی کی عمر کسی طرح سولہ سال سے زیادہ نہ تھی، اتنی شرمیلی لڑکی میں نے آج تک نہ دیکھی تھی، اس کا چہرہ زرد تھا لیکن آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ اس کا چہرہ غازے سے پتا ہوا تھا، بیش قیمت جواہرات اس کے بدن پر سجے ہوئے تھے، واقعی وہ بالکل گڑیا معلوم ہوتی تھی، اتنی خاموش جیسے بُت۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا یہ ایک نئی شادی شدہ دلہن ہے

میں نے کہا۔

"ماشاءاللہ —— کتنی خوبصورت لڑکی ہے"

اس دلہن کو رسم کے مطابق تین دن تک اس کمرے میں نظر بند رہنا تھا۔

میں نے رواج کا یہ حال معلوم کرنے کے بعد کہا۔

"پھر تو استنبول (قسطنطنیہ) میں شادی مسرت کی بجائے زحمت ہے۔"

یہ لڑکی ایک بہت بڑے پاشا کی بیٹی تھی، آج یہ دلہن بنی بیٹھی تھی اور اس کے سامنے تحائف کا انبار لگا تھا، آج اسے زندگی کا ایک رفیق میسّر آ گیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس نے شادی سے پہلے اپنے شوہر کو دیکھا تک نہ تھا۔ لیکن دولہا اور دلہن کے باپ بچپن سے ایک دوسرے کے دوست تھے —— بڑے گہرے دوست! بھلا اس سے بڑھ کر موزوں رشتہ اور کیا ہو سکتا تھا؟

اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے پھر اپنا وطن یاد آگیا، جہاں نوجوان لڑکیاں اور لڑکے آزادی کے ساتھ میلوں ٹھیلوں میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے، ایک دوسرے کو تحائف دیتے تھے، باتیں کرتے تھے ہنستے بولتے تھے اور والدین کی آنکھ بچا کر کبھی کبھی مسکرا بھی دیتے ، اور زندگی کا رُخ بدل جایا کرتا۔

میں نے اپنی ایک سہیلی سے کہا۔

"شاید لڑکی بھی ان طور طریقوں سے خوش ہے ؟"

اس نے جواب دیا

"بہت خوش ــــ یہ اس کی زندگی کا سب سے زیادہ مسرت بخش دن ہے ؟"

میں نے پوچھا

"لیکن دولہا کو بھی تو دیکھنا چاہیئے وہ کیسا ہے ؟"

میری سہیلی نے جواب دیا

"وہ باہر مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہے۔ جبتک تنہائی کے یہ تین دن نہ گذر جائیں یہ دلہن کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا، البتہ اس کے بعد اسے حق ہے کہ آئے اور اسے لے جائے، یہاں کا رواج یہ ہے کہ دولہا جب دلہن کو لینے آتا ہے کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جس سے دلہن ہنس دے اگر وہ نہیں ہنستی تو اسے پانچ اشرفیاں نذر کرنی پڑتی ہیں، جب تک لڑکی کو ہنسانہ دے، ہر ناکامی کے بعد پانچ اشرفیاں پیش کرنے پر وہ مجبور ہے۔ یہاں تک کہ عاجز آ کر دلہن کو ہنسنا ہی پڑتا ہے، کچھ عرصہ تک دلہن اور اس کا شوہر لڑکی کے والدین کے ہاں رہتے ہیں، اس کے بعد اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔"

بڑی دیر تک شادی کی اس محفل میں ہم لوگ بیٹھے، اس کے بعد میزبان سے اجازت چاہی اور پھر حرم سرا میں واپس آگئے۔

---

(۲۵)

قفسِ زرّیں

پاشا کی دعوت سے ہم لوگ خوش خوش آئے بہت دنوں کے بعد ایسا موقع میسر آیا تھا کہ آزادانہ فضا میں گلگشت اور سیر و تفریح کا موقع ملا تھا، لیکن اس خوشی اور جوشِ طرب کے باوجود ایک چیز بُری طرح مجھے کھٹک رہی تھی ——

—— عزیزی بہت افسردہ تھی؛ میں نے اُسے ہنسانے اور خوش کرنے کی بہت سی تدبیریں کیں، لیکن اس کے دل کی پژمردہ کلی نہ کھل سکی، نہ وہ ہنسی نہ مسکرائی چُپ خاموش، جیسے کسی گہری فکر میں ہو۔

"عزیزی تم اتنی افسردہ اور رنجیدہ کیوں نظر آ رہی ہو؟ میں نے کہا۔ ہر وہ چیز تمہیں حاصل ہے، جو تمہارا غم دُور کر سکے، تمہیں خوش رکھ سکے۔"

"میں اس زندگی کو پسند نہیں کرتی۔ میں اس سے عاجز آ گئی ہوں!" بڑی سنجیدگی کے ساتھ عزیزی نے کہا، "میں اپنے وطن اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں میں یہاں خوش نہیں ہوں، کسی طرح بھی اس ماحول میں اس زندگی میں اس حرم سرا کی دنیا میں خوش نہیں رہ سکتی۔"

میں نے حیرت اور تعجب کے ساتھ عزیزی کی باتیں سنیں، پھر کہا،

"لیکن میری بہن یہ تو سوچو، بہ فرضِ محال اگر تم چلی بھی گئیں تو کیا وہاں، کھپ سکو گی؟ اب وہاں تمہارا کوئی مقام ہوگا؟ کیا وہی عزت، وہی جگہ پھر حاصل کر سکو گی جو پہلے تمہیں حاصل تھی؟ —— میرا خیال تو یہ ہے کہ وہاں جاکر تم یہاں سے زیادہ اداس رہو گی، گھر والوں کے لئے ایک بوجھ بن جاؤ گی جسے ان بیچاروں کے لئے نہ اتار تے بنے گا۔ نہ رکھتے۔

عزیزی میری باتیں غور سے سنتی رہی، پھر اس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا،

"ایسا نہ کہو —— مجھے مایوس اور دل برداشتہ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ کچھ بھی ہو میں جا رہی جانا چاہتی ہوں، وہاں کی آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی ہوں، وہاں کی پہاڑیاں مجھے بلا رہی ہیں، وہاں کی وادیاں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں، وہاں کی زندگی مجھے دعوت دے رہی ہے —— جو زندگی میں یہاں بسر کر رہی ہوں اس سے تنگ آگئی ہوں، کسی طرح اور کسی قیمت پر بھی اس سے مانوس نہیں ہو سکتی ——

میں نے کہا،

عزیزی آخر تم چاہتی کیا ہو؟

وہ بولی،

"وہ تو میں بتا چکی!"

"لیکن ناممکن کی آرزو سے حاصل کیا؟"

"اگر ہمت ہو تو ناممکن کو بھی ممکن کیا جا سکتا ہے!"

"کس طرح؟"

"یہ حالات پر منحصر ہے۔!

خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو، عزیزی حوصلے سے کام لو، ہمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو، جو زندگی بسر کر رہی ہو، اسی کو سب کچھ سمجھو، خوش رہو، ہنسو، مسکراؤ ——— یہاں کیا نہیں ہے؟ جو چاہو حاصل کر سکتی ہو، خرید سکتی ہو ایسی زندگی کو چھوڑ کر تو اچھلی زندگی کی طلب میں دوڑنا عقلمندی نہیں حماقت ہے۔ اور کم از کم میں تو یہ مشورہ نہیں دے سکتی کہ عقلمندی کا راستہ چھوڑ کر حماقت کی راہ اختیار کرو،!

میری باتوں کے جواب میں عزیزی نے کہا،

"جس زندگی کی تم اتنی تعریف کر رہی ہو، وہ قفس کی زندگی ہے، مانتی ہوں یہ قفس زریں ہے، سونے کا بنا ہوا، ہیرے جواہرات سے جڑا ہوا خوبصورت بیش قیمت ——— لیکن کچھ بھی ہو قفس آخر قفس ہے"

میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے رازدارانہ طور پر کہا،

"تمہیں کیا ہو گیا ہے، بھلا کوئی ایسی باتیں بھی کرتا ہے۔ اگر کسی کے کان میں ان باتوں کی بھنک پڑ گئی، نہ تمہاری خیر ہے نہ میری!"

وہ بے خوفی، اور استقلال کے ساتھ گویا ہوئی،

"میں اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتی کہ میری باتیں کوئی سن لے گا، کبھی کبھی تو میں ایسا محسوس کرنے لگتی ہوں، جیسے میرا دل پھٹ جائے گا، میرے دماغ کی رگیں ٹوٹ جائیں گی ——— میری حیثیت کیا ہے؟ جانتی ہو؟"

میں نے آہستہ سے کہا،

"نہیں جانتی ——— بتاؤ!"

اس کے ہونٹوں پر طنز سے بھرا ہوا تبسم نمایاں ہوا، پھر وہ بولی،

"میں قربانی کی بھیڑ ہوں جسے خوب اچھی طرح

کچھ آسان تھا؛ یہاں سے ایک چیونٹی تک بے اجازت باہر نکل سکتی تھی،
پھر عزیزی کس طرح اس قفسِ زریں کو خیرباد کہہ سکتی تھی؛ ———
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، !

---

(۲۶)

محبّت کا راز

تھوڑی دیر تک ہم دونوں بالکل خاموش بیٹھے رہے، جب عزیزی کے دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو وہ گویا ہوئی،

"نشاط، ———— آج میں تمہیں اپنا ایک راز بتانا چاہتی ہوں سنو گی ؟"

میں نے اشتیاق اور اضطراب کے ساتھ جواب دیا،

"ضرور سنوں گی، کہو،"

وہ کہنے لگی،

"یہ غم میرا دل کھوکھلا کر چکا ہے — اب میرے دل میں کچھ نہیں رہ گیا ہے"

میں نے ہمدردی اور دلسوزی کے لہجہ میں سوال کیا،

"کون سا غم میری بہن ؟"

وہ کہنے لگی ———— اس وقت کا غم نصیب چہرہ دیکھنے کے قابل تھا،

"رات کو جب تم سو جاتی ہو، جب سب سو جاتے ہیں، میں جاگتی رہ رہ
جاگتی رہتی ہوں، وہی وقت ہوتا ہے جب آنسو کسی طرح نہیں تھمتے، جب موت
زندگی کے مقابلہ میں زیادہ خوشگوار معلوم ہونے لگتی ہے، جب جی چاہتا ہے کہ اپنے
ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لوں؛!"

یہ باتیں سُن کر میں لرز گئی، میں نے کہا،

"وہ کون سا غم ہے، میری پیاری عزیزی جس نے تیرا یہ حال کر رکھا ہے؟"

"وہ گویا ہوئی،

"یہ اس دن کا واقعہ ہے، جس روز میں بردہ فروشوں کے ہاتھ آئی ——

"ہاں کہے جاؤ میں سن رہی ہوں!"

"میرا ابن عم، جو مجھ سے دو سال بڑا تھا، ہمارے گھر مہمان بن کر آیا تھا،
وہ کئی دن تک رہا، اور یہ دن اس طرح گذر گئے، جیسے ایک گھڑی پلک جھپکتے میں
گزر جاتی ہے ——————

"تم اس سے محبت کرتی تھیں؟"

"ہاں نشاط —————— ہم دونوں ایک دوسرے کو دل و جان
سے چاہتے تھے، وہ مجھ پر ہزار جان سے فریفتہ تھا، میں روح کی گہرائیوں کے ساتھ
اسے چاہتی تھی، اسے میرے بغیر قرار نہیں تھا، میں اس کے بغیر زندگی کو بے کیف
محسوس کرتی تھی، جب تک وہ رہا، ہمارا سارا وقت اپنی داستان سرائیوں میں صرف
ہو رہا، نہ اس کی باتیں سنتے سنتے میں تھکتی تھی، اور نہ میری باتوں سے اُسے اکتاہٹ
ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے یہ شب و روز صرف اس لئے بنے ہیں کہ ہم
دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہیں ——————

"ہاں پھر؟ ——————"

"شام کا وقت تھا، اور آج وہ رخصت ہو رہا تھا۔"

"اپنے گھر جا رہا تھا؟"

"ہاں —————— رخصت کے وقت پھر ہم دونوں نے تجدید محبت کی، اس نے جلد از جلد واپس آنے کا وعدہ کیا میں نے کہا، جب تک تم نہیں آؤ گے میرے دل کو قرار نہیں آئے گا، اس نے وعدہ کی تجدید کی، پھر وہ اپنے اسپ شکیں پر رکاب میں پاؤں رکھ کر سوار ہو گیا، اور میرے دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا، جب تک اس کی گرد پا نظر آتی رہی، میں اسی طرف دیکھتی رہی، یہاں تک کہ پہاڑوں کے راستہ میں پہنچ کر، وہ غائب ہو گیا، ——"

——————

"ہاں عزیزی پھر —————— ؟"

"اس کے جانے کے بعد میرا دل کچھ ایسا افسردہ اور مغموم ہوا کہ گھر کے اندر واپس جانے کا جی نہیں چاہا، وہیں سبزہ نورستہ پر میں لیٹ گئی، اور عالم خیال کی سیر کرنے لگی،"

"زندگی کے ولولے ——— ..."

"ہاں —————— اس کے بغیر زندگی کوئی معنیٰ ہی نہیں رکھتی تھی۔"

"پھر کیا ہوا عزیزی؟"

"بس میں اسی کو پیار کرتی رہی، محبت کے جوش سے بے تاب ہو کر جو باتیں کیا کرتا تھا وہ میرے کانوں میں گونجنے لگیں، میں خود بھی عالم خیال میں اس سے باتیں کرنے لگی۔"

"ہاں ہجر و وصال کی باتیں —————— کیوں عزیزی؟"

"ہاں نشاط اور کیا،"

"اس کا نام کیا تھا؟"

"نام؟ —— یوں تو اس کا نام معراج تھا لیکن گھر میں پیارے سب اُسے "مہرا" کہا کرتے تھے۔ یہ نام مجھے بہت پسند تھا، اسی نام سے میں بھی اسے یاد کیا کرتی تھی۔ میری زبان سے اپنا یہ نام سُن کر وہ اتنا خوش ہوتا تھا، جیسے جہان کی نعمت اُسے مل گئی ہو"؛

"ٹھیک ہے —— تو کیا تمہاری شادی اس سے طے ہو گئی تھی؟"

"ہاں —— ہماری شادی طے تھی، فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ایک سال تک محنت مشقت کر کے وہ کچھ پس انداز کر لے تاکہ شادی کا بوجھ اُٹھا سکے یعنی کم از کم اپنا ایک مختصر سا گھر بنا لے، پھر شادی کے بعد ہم وہیں منتقل ہو جائیں گے، گھر کی جگہ بھی طے ہو چکی تھی، وادی کے بالکل سامنے، ایک پُرفضا اور خوبصورت ٹکڑا اس کام کے لئے منتخب کر لیا گیا تھا،"

"مہرا تھا کیسا آدمی؟"

"یہ مجھ سے پُوچھتی ہو؟"

"اور کس سے پُوچھوں؟"

"میری نظر میں دُنیا کا سب سے زیادہ حسین آدمی وہی تھا گورا چٹا، دراز قامت، مضبوط اور تنومند، فیاض اور دریا دل، بہادر اور شجاع نیک اور شریف، غیور اور خود دار، رحم دل اور رقیق القلب، وہ کون سی صفت تھی جو اس میں نہ تھی —— نشاط میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں، میں اس سے کتنی محبت کرتی تھی —— ——

"میں جانتی ہوں، تمہارے سمجھائے بغیر سب کچھ سمجھ گئی ہوں!"

"نہیں نشاط تم اندازہ نہیں کر سکتیں!"

"ممکن ہے تمہارا خیال صحیح ہو، بہر حال اتنا احساس تو مجھے ہو گیا ہے، کہ تم مہرا کو بہت زیادہ چاہتی تھیں،"

"ہاں نشاط بہت زیادہ اپنی جان سے بھی زیادہ —— وہ میری روح تھا میری زندگی تھا، —— میں نے کیا کہا؟ وہ میری روح تھا —— تھا نہیں ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس کی رفیقۂ حیات صرف میں ہی بن سکتی ہوں میرے سوا وہ کسی سے شادی نہیں کر سکتا کسی سے خوش نہیں رہ سکتا —— نشاط وہ مجھے یاد کر رہا ہے، میری یاد میں کڑھ رہا ہے، تڑپ رہا ہے، اور میں یہاں ہوں، اس قفسِ زریں میں —— کیا مجھے یہ زیب دیتا ہے کہ اُسے چھوڑ کر میں یہاں محبوبۂ سلطان والا شان بننے کی کوشش کروں؟ —— نہیں نشاط ایسا نہیں ہو سکتا۔ مہرا میرے لئے ہے، میں اس کے لئے ہوں، ہم دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے لئے وقف ہے،"

"عزیزی میں تمہارے جذبات کو سمجھ رہی ہوں!"

"نشاط —— اب تو وہ چھوٹی سی کٹیا بھی بن کر تیار ہو گئی ہے، جو میرے لئے وہ بنا رہا تھا، جہاں شادی کے بعد ہمیں اپنی زندگی بسر کرنا تھی —— وہ کٹیا، وہ معمولی سا مکان —— وہ جنت، وہ جنت الفردوس —— آہ نشاط مجھے وہاں جانے دو۔ میں ضرور وہاں جاؤں گی، کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی ——"

"عزیزی، حوصلہ قائم رکھو، خدا مدد کرنے والا ہے، اُس پر بھروسہ کرو"
جب میں اُس کے پاس پہنچوں گی، وہ کتنا خوش ہوگا!"
"یقیناً اسے بہت خوشی ہوگی!"
"میں اُس کی خدمت کروں گی، اس کی راحت و آسائش کا خیال رکھوں گی،
اسے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہونے دوں گی، اور پھر وہ محسوس کرے گا کہ عزیزی صرف
محبوبۂ دل نواز ہی نہیں ہے، ایک وفادار، کارگزار اور فرض شناس بیوی بھی ہے

بے شک بے شک ——— خدا وہ مبارک دن لائے!"
"یہ محلسرا، یہ حرم سرا، یہ جہاں کا جاہ و حشم، یہ دبدبہ، یہ طنطنہ، یہ شان و
شکوہ، یہ امارت و ثروت کے جلوے، یہ سیم و زر کی ریل پیل، یہ ہیرے جواہرات
کے تحفے، یہ نادر اور کمیاب زیورات، یہ گراں قیمت ریشمیں قیمتی ملبوسات، یہ شاہانہ
زندگی، یہ ٹھاٹھ، یہ اقتدار، یہ اختیار ——— یہ ساری چیزیں
ہیچ ہیں، اس زندگی کے مقابلہ میں جو مہرا کے ساتھ بسر ہوگی!"
"ہاں عزیزی، ٹھیک کہتی ہو!"
"نشاط ———"
"کہو، کیا کہتی ہو؟"
"اس موجودہ زندگی کو میں حقیر اور ذلیل سمجھتی ہوں ——— مجھے
نہیں چاہیے، اشرفیاں بھی نہیں درکار، یہ ہیرے جواہرات، میری نظر
کنکر اور پتھر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، یہ ریشمی ملبوسات کیا ہیں؟
——— صرف چیتھڑے، یہ کوشک، یہ باندیاں، یہ غلام، یہ تجمل اور شکوہ
کی زندگی سب بیکار ——— مجھے یہ کچھ نہیں چاہیے، جاؤ

ے کیا چاہیئے ——————— ؟

ہاں ——————— مہرا!"

نشاط میری پیاری بہن، میری ہمدرد، میری غم گسار،

تو نے ٹھیک کہا، میرے درد کا علاج مہرا ہے، میری زندگی کا سکون صرف مہرا کے پاس ہے!"

میں اس دیوانی لڑکی کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی،

یہ مہرا کی محبت میں دیوانی ہو رہی تھی، اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ

جہاں ہے، وہاں مہرا کسی طرح بھی نہیں پہنچ سکتا، اور وہ بھی اس قفسِ زریں سے

آزادی حاصل کر کے اس کے پاس نہیں جا سکتی،

لیکن میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ نصیحت بیکار ہے ———

وہ جس دھن میں، جس خیال میں مست ہے، اسی میں مست رہے گی، وہ اس

خیال سے باہر نہیں نکل سکتی، اور اگر نکلی تو صرف مر کر نکل سکے گی،

میں نے دیکھا یہ باتیں کرتے کرتے عزیزی کی آنکھیں بھر بھر آئیں!

وہ رونے لگی،

وہی ہچکیاں اور سسکیاں،!"

میں نے اپنے دوپٹے کے آنچل سے اس کے آنسو پونچھے، اسے دلاسا دیتے

ہوئے کہا۔

"میری بہن میری پیاری عزیزی، تو روتی کیوں ہے؟"

بڑی حسرت سے وہ گویا ہوئی،

"تو پھر کیا کروں؟ ——————— نشاط رونے سے دل ہلکا ہو جاتا

ہے، غم کم ہو جاتا ہے ——————— ایک مصیبت یہ بھی تو ہے کہ رونے کا

وقت اور موقع بھی یہاں میسر نہیں آتا، کس کے سامنے روؤں؟ کون میرے آنسو پونچھے گا؟

——— آج اتفاق سے تم اس طرح مل گئیں کہ دل کا درد تم
سے بیان کر دیا،
آنسو اُمڈے تو رونے لگی،
مجھے رونے دو نشاط،
اور وہ پھر رونے لگی،!

———

(۲۷)

وہ بردہ فروش

عزیزی کی حالت اس وقت ناگفتہ بہ تھی اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، سارا بدن کانپ رہا تھا، میں نے کہا۔

"اچھا اب اس ذکر کو چھوڑو، کچھ اور باتیں کرو۔"

وہ کہنے لگی،

"آخر بے درد نہ بنو نشاط ——— اس ذکر کے سوا میرے پاس اور ہے کیا، اور تمہارے سوا اس دنیا میں کیا کوئی ایسی ہستی بھی ہے، جس سے اپنا رازدل کہہ سکوں، جسے اپنا غم خوار اور راز دار خیال کر سکوں؟ ——— اس دنیا میں میرا صرف ایک دوست ہے اور وہ ہے نشاط ——— تو!"

میں نے سوچا اگر اس کے دل کا بوجھ ان باتوں سے ہلکا ہوتا ہے، تو پھر کچھ دیر یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیئے، میں نے کہا،

"تم نے اتنی ساری باتیں کر ڈالیں، مگر یہ نہ بتایا کہ جارجیا سے قسطنطنیہ کس طرح پہنچ گئیں؟"

وہ کہنے لگی

یہی تو بتانے لگی تھی، تم نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھا لیا،

میں نے اشتیاق کے ساتھ کہا،

تو پھر اب کہہ ڈالو نا یہ داستان بھی!"

وہ گویا ہوئی،

مہرا کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک تو میں گھاس پر لیٹی، عالمِ خیال میں سے باتیں کرتی رہی پھر خوشی کا جھولا جھولتی اور چند روز بعد اس کی شرتج آمد کے خیال سے خوش خوش گھر میں داخل ہوئی،

سب سے پہلے والدہ سے مڈبھیڑ ہوئی، میں نے سوچا اپنا ایک راز آج انہیں بتا دوں ——— جانتی ہو وہ راز!"

میں نے کہا

عزیزی تم تو پہیلیاں بجھواتی ہو، صاف صاف کہو نا؛

وہ گویا ہوئی،

مہرا نے چلتے وقت چپکے سے لمبی لمبی آستینوں میں ایک چیز چھپا دی تھی ——— وہ تھی چاندی کی پہنچی!"

"اچھا معاملہ یہاں تک بڑھ گیا تھا؛"

"ہاں ——— وہ مجھے بہت چاہتا تھا؛"

"یہ تو معلوم ہو گیا ——— لیکن یہ تحفے تحائف، وہ بھی چوری چھپے کیوں؟"

اس میں بھی ایک لطف تھا ——— وہ چاہتا تھا، شادی سے پہلے کئی قسم کے زیورات مجھے لا دے!"

"بڑا اچھا آدمی تھا!"

"بہت اچھا ———— ہاں تو میں نے چاہا کہ والدہ پر یہ چوری منکشف کردوں، وہ میرے رازدار بھی تو تھیں لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہہ نہ سکی، جیسے کسی نے میری زبان بند کر دی!"

والدہ، والد کے لئے کھانا تیار کرنے میں مصروف تھیں، انہوں نے مجھ سے کہا۔

"بیٹی، ذرا میری مدد کرو، میں گوشت بھون رہی ہوں، تم جلدی جلدی روٹی پکالو ———— !"

میں آٹا گوندھنے لگی،

اتنے میں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی سرپٹ گھوڑا دوڑتا ہوا ہمارے گھر کے پاس سے گذر رہا ہے۔

میرے دل سے آواز آئی،

"ہو نہ ہو یہ مہرا ہے!"

یہ خیال آتے ہی میں آٹا وہیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگی بھاگی باہر آئی، کہ اگر واقعی مہرا آیا ہو، تو اندر لاکر اُسے بھی کھانا کھلاؤں ————

لیکن ————

لیکن یہ مہرا نہیں تھا۔

"پھر کون تھا؟"

"کوئی اور ———— ایک اجنبی آدمی،

"آخر کون ہے؟"

"ایک لمبا تڑنگا آدمی، صورت بھیانک، خوفناک آنکھیں، چہرہ پر

سفاکی اور شقاوت کے آثار، بھیڑ کی کھال کا کوٹ پہنے، ایک لمبی کالی سی ٹوپی اوڑھے کھڑا تھا۔

اس آدمی کو دیکھ کر میں سہم گئی، لیکن میں نے اپنے حواس قابو میں رکھے، میں نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، مجھے گھورنے لگا، ان نگاہوں کی میں تاب نہ لا سکی، نہ جانے کیا بات تھی، خوف اور دہشت کی کیفیت طاری ہو گئی مجھ پر، وہ مجھے گھور رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے سر سے لے کر پاؤں تک میرا جائزہ لے رہا ہے۔

میں اب تک اپنی جگہ کھڑی تھی، حواس باختہ، دہشت زدہ، دفعتہً اس آدمی نے اپنے بازو پھیلائے اور مجھے پکڑ لیا۔ میں لاکھ لاکھ تڑپی، پھڑکی، لیکن اس کے بازو کے شکنجے سے آزاد نہ ہو سکی، بجلی کی سی سرعت سے وہ مجھے لئے لئے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھ کر زین پر بیٹھ گیا، ایڑ لگائی، اور زور سے ایک چابک مارا، گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا،

"ہائے اللہ!"

عزیزی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے،

"میں چیخی، چلائی، لیکن اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، میری چیخیں گھٹ کر رہ گئیں، ... ہو گئی۔

عزیزی کی یہ کہانی سن کر مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا، اس نے کہا،

"آخری چیز جس پر میری نظر پڑی وہ میری ماں تھی، جو دیوانہ وار عزیزی

میری عزیزی، میری بچی، میری جان، میری زندگی، میری روح کہتی، چیختی، بھاگتے ہوئے گھوڑے کے پیچھے دوڑ رہی تھی —————— میری بے بس ماں کہ جس کی آنکھوں کے سامنے اس کی پُونجی لُٹی جا رہی تھی، اور وہ کچھ نہ کر سکتی تھی، بھلا وہ کب تک اس بھاگتے ہوئے گھوڑے کا تعاقب کرتی، آخر تھک ہار کر گر پڑی، اور وہ مکار مجھے لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا،

"خدا غارت کرے اسے!"

- معلوم نہیں خدا نے اسے غارت کیا یا نہیں لیکن میں تو واقعی غارت ہو گئی!" —————— جب تک مجھے ہوش رہا، میں اپنی ماں کی جگر فگار چیخ سنتی رہی —————— پھر میں بیہوش ہو گئی۔

---

(۲۸)

عزیزی سمندر میں کود گئی

جب عزیزی کا جی ذرا ٹھہرا تو پھر اس نے اپنی کہانی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ شروع کیا، وہ کہنے لگی،

جب ہوش آیا ——— اور نہ جانے کب آیا ——— سفر جاری تھا، میں مجبور و بے بس سفر جاری رکھنے پر مجبور تھی، یہاں تک کہ ایک بندرگاہ پر ایک قافلہ ملا، جس آدمی نے مجھے گرفتار کیا تھا، شاید وہ اسی قافلہ کا سرغنہ قافلہ کے ساتھ میری طرح اور بہت سی لوگ نزار نزار نزار، لڑکیاں تھیں، یہاں سے ہمارا یہ قافلہ ایک "عورت مارکیٹ" میں پہنچا ——— یہ کیا ——— دہشت ناک خواب تھا، خواب نہیں حریاں اور برہنہ حقیقت ——— اس کے بعد تم مجھ سے مذاق کرتی ہو!"

میں نے اسے ٹوکا

"مذاق! ——— یہ کیا کہہ رہی ہو تم!"

وہ تیکھے لہجہ میں بولی،

ابھی تم نے کہا نہیں تھا کہ میں محبوبۂ سلطان بن سکتی ہوں ؟"

"ہاں کہا مگر غلط تو نہیں ؟"

وہ بڑے درشت اور سخت لہجہ میں گویا ہوئی،

"بالکل غلط ——— تم مجھے زندگی کا لالچ دیتی ہو؛ تم مجھے عیش و طرب کی دعوت دیتی ہو ؛ تم مجھے سلطان کے شبستان عیش میں رہنے اس کی زینتِ پہلو بننے اور اس کی محبوبۂ دل نواز بننے کی ترغیب دیتی ہو ——— ؟

ہاں تو کیا ہوا ؟

"یہ سب چیزیں میرے لئے باعثِ ننگ ہیں، میرا سلطان، میرا مہرا ہے میرا شبستان عیش وہ کٹیا ہے جو اس نے میرے لئے تیار کر رکھی ہو گی، میرا عیش و طرب یہاں، اس حرم سلطانی میں نہیں ———

"پھر کہاں ہے ؟"

ناممکن ہے عزیزی ناممکن ۔

"جارجیا میں میرے وطن میں ؟"

"نشاط ——— اگر یہ ناممکن ہے، اگر یہ آرزو ناممکن کی ہے، تو کان کھول کر سن لو میں زندہ نہیں رہنا چاہتی، میں زندگی سے نفرت کرتی ہوں، موت میری محبوبۂ دل نواز ہے، میں اس کے پاس جاؤں گی، اس کی گود میں مجھے سکون ملے گا، اس کے آغوش میں راحت پا سکتی ہوں سن لیا تم نے نشاط ؟"

عزیزی کی یہ باتیں میرے دل پر اثر کر رہی تھیں، میں اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی، بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن باندی نے آ کر سارا پروگرام درہم برہم کر دیا اس نے کہا۔

"رات کا کھانا تیار ہے، دسترخوان بچھ چکا ہے، آپ کا انتظار ہو رہا ہے"

میں نے سوچا، یہ اچھا موقع مل گیا ہے، آج چاندنی رات ہے، کھانے سے فارغ ہو کر فدا یا مغورس کی سیر کریں گے۔ کشتی میں بیٹھ کر چاندنی کی روشنی یہ دنیا، یہ عمارتیں، یہ شہر، یہ مینار، یہ خانقاہیں، یہ بلند و بالا [illegible] سی جاذب نظر آتی ہیں، اس طرح عزیزی کا دل بہل جائے گا۔ اس کے خیالات بٹ جائیں گے ممکن ہے یہ ذہنی تلخیاں کسی حد تک کم ہو جائیں،

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا،

"چلو عزیزی کھانا کھا لیں!"

وہ کچھ نہ بولی، چپ چاپ میرے ساتھ ہو لی، دسترخوان پر ہم دونوں پاس ہی پاس بیٹھے، میں نے دیکھا، بڑی بے دلی سے وہ کھا رہی ہے، کھا کیا رہی ہے "ٹونگ رہی ہے، یوں ہی دکھاوے کو، میں نے کہا،

عزیزی کیا کر رہی ہو، کھاتی کیوں نہیں؟

وہ کہنے لگی،

کھا تو رہی ہوں؟

یہ الفاظ اس نے اس طرح کہے جیسے عالم بیداری میں نہیں عالم خواب میں بول رہی ہے۔

میں اس کی یہ حالت دیکھ کر خاموش نہ رہ سکی۔ میں نے پوچھا،

خیر تو ہے؟ کچھ بیمار ہو؟ طبیعت خراب ہے کچھ؟

اس نے مختصر سا جواب دیا،

"نہیں تو...!"

"اس کی حالت میں آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، ان الفاظ پر کس طرح یقین

کرلیتی ؛ میں نے کہا،

"اگر جی نہیں چاہتا نہ کھاؤ، نیند آرہی ہو تو جاؤ سو رہو جاکر !"

وہ اسی خواب آلود لہجہ میں گویا ہوئی،

"میں بیمار نہیں ہوں ——— نیند بھی نہیں آرہی ہے !"

آخر کھانے سے فارغ ہوکر، ہم کشتیوں میں بیٹھے، اور باسفورس کی سیر کرنے لگے، عزیزی میرے ساتھ تھی !

چودھویں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا، اور اس سے بھی زیادہ روشن چاند میرے پاس میرے پہلو میں بیٹھا تھا ——— میری عزیزی ——— منظر اتنا دلکش تھا کہ تعریف نہیں ہوسکتی، سمندر اتنا ساکن تھا کہ معلوم ہوتا جیسے کسی نے نیلے رنگ کے مخمل کا قالین بچھا دیا ہے، تارے آسمان پر چمک رہے تھے، آس پاس کی بھینی خوشبو نے مشامِ جان معطر کر رکھا تھا، شہر کی عمارتوں کی روشنیاں دور سے ٹمٹماتی ہوئی نظر آرہی تھیں اور بڑی بھلی لگ رہی تھیں،

ہماری سہیلیاں اس منظر سے لطف اندوز ہو ہو کر آپس میں ہنسی مذاق، اور دل لگی کی باتیں کر رہی تھیں، عزیزی میرے پاس بیٹھی تھی، لیکن چپ !

میں نے محبت بھرے لہجہ میں کہا،

"کیوں عزیزی منظر کتنا سہانا، کتنا پیارا ہے ؛ ہے نا ؛"

اس نے نیم خواب کیفیت میں ڈوبے ڈوبے کہا

"ہاں ——— ہاں !"

اور پھر خاموش ہوگئی،

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اب طبیعت کچھ ٹھیک ہے ؛"

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور کہنے لگی،

"نشاط ————————

میں نے جواب دیا۔

"ہاں عزیزی! کہو، کچھ کہنا چاہتی؟"

عزیزی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا،

"کیا تم پانی سے خوف کھاتی ہو؟"

میں نے مجسمۂ شجاعت بن کر جواب دیا۔

"بالکل نہیں ———— لیکن تم نے یہ کیوں پوچھا؛ کیا ہماری کشتی ہل ڈول رہی ہے؟"

وہ ذرا کے ذرا مسکرائی پھر بولی،

"نہیں تو، لیکن اگر یہ ہلنے ڈلنے لگے، کیا تب بھی نہیں ڈرو گی؟"

میں نے مطمئن لہجہ میں کہا

"تب بھی نہیں ڈرنے کی ———— لیکن یہ وہم تمہارے دل میں کیوں آرہا ہے؛ دیکھتی نہیں ہو، کتنی روانی کے ساتھ ہماری کشتی تیر رہی ہے؛ نہ کوئی ہچکولا ہے، نہ جھٹکا!"

عزیزی نے جیسے میرے یہ دلائل نہیں سنے، اس نے پوچھا،

"نشاط کیا تم موت سے ڈرتی ہو؟"

میں مسکرائی، پھر زور سے ہنس پڑی، میں نے کہا۔

"ذرا بھی نہیں ———— لیکن موت کی باتوں کا یہ کون سا موقع ہے؟"

میں نے اپنی بہادری ظاہر تو کر دی، لیکن حقیقتاً عزیزی کے اس سوال نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا، اس خطرناک سوال نے میرے اندر وحشت کی کیفیت پیدا کر دی تھی

وہ کہنے لگی،

"یوں ہی پوچھ لیا ——— تم سمجھی کیوں جا رہی ہو ؟"

میں نے پھر بہادری کی نمائش کرتے ہوئے کہا،

"میں کیوں سمجھتی ؟ ——— عزیزی ایسی باتیں نہ کرو !"

وہ مسکرانے لگی،

"کیوں بھلا ؟ ——— ان باتوں سے آخر تم بھڑکتی کیوں ہو ؟"

میں نے جواب دیا۔

"ہر بات ہر موقع پر زیب نہیں دیتی !"

اس نے اعتراض کرتے ہوئے کہا،

"اس وقت کون سی بات کرنا چاہئے ، کون سی بات زیب دے گی ؟"

میں نے بتایا،

"دیکھو چاند کتنا بھلا لگ رہا ہے ، رات کتنی سہانی ہے ، یہ چاندنی ، یہ پُر کیف منظر ، یہ سہانی رات آنکھوں کے راستے روح کی گہرائی میں اترتی جا رہی ہے ——— کیا تم بھی یہی محسوس نہیں کرتیں ؟"

وہ مدھم آواز میں بولی

"کرتی ہوں ——— واقعی لُٹ ہلا ، یہ سہانا منظر آنکھوں کے راستہ میں روح کی گہرائی میں اترا جا رہا ہے،

عزیزی نے یہ الفاظ کچھ اتنی آہستگی لیکن برق رفتاری کے ساتھ کہے کہ میں اس کا ساتھ نہ دے سکی ، مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا ،

"کیا تمہیں یقین ہے کہ جنت میں مرنے کے بعد ایک دوسرے سے ملیں گے"

میں نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا ۔

"ہاں عزیزی میرا یہ عقیدہ ہے ———————— لیکن خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو، آخر موت سے اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی ہے تمہیں کہ جب دیکھو ہر وقت اسی کا ذکر کرنے لگتی ہو، ابھی ہم جوان ہیں، ابھی ہمیں زندہ رہنا ہے۔ ابھی ہم نے دُنیا کا دیکھا ہی کیا ہے؟"

وہ کچھ عجیب طرح کے انداز میں گویا ہوئی،

"بہن ایسا نہ کہو ———————— موت ہی تو میرے قفس زریں کی کنجی ہے ————"

عزیزہ کے یہ الفاظ سُنکر، میں پاس کی دوسری لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگی کہ مبادا ان میں سے کسی نے سُن لیا ہو، اور قیامت آجائے، کیونکہ رشک حسد کی کارفرمائی ہم سے برابر جاری رہتی تھی، ذرا موقع ملجائے، اور لگائی بجھائی، سازش اور مخالفت اور دراندازی کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، اور اس وقت عزیزی نے ایسے الفاظ استعمال کئے تھے، جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔

یکایک میرے کان میں ایک چیخ کی آواز آئی، ————

اور پھر خواجہ سراؤں کا شور و غل شروع ہو گیا، جو ایک دوسرے کو پکار رہے تھے،

میں نے دیکھا!

آہ میں نے دیکھا عزیزی نہیں تھی، میں نے نام سے پکارا، پھر پکارا، بار بار پکارا، اگر جواب کون دیتا، وہ تو سمندر میں کود چکی تھی، موت کی گود میں پہنچ چکی تھی، سمندر کی تہہ اس کے لئے آغوش قبر بن چکی تھی ———— میری آواز لرز رہی تھی، میرا سارا بدن کانپ رہا تھا، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، میرا

ہونٹ خشک ہو رہے تھے، میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے، میری آنکھوں تلے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

ملاحوں نے کشتیاں روک دیں، تلاش و جستجو کا کام شروع ہو گیا ______ لیکن عزیزی اب کہاں تھی، جو کسی کے ہاتھ آتی؛

خواجہ سرا زور زور سے چیخ رہے تھے، اور سمندر کھنگال کر اسے نکالنے کی جدوجہد کر رہے تھے لیکن اب وہ ان باتوں سے دور بہت دور، جا چکی تھی،

اس حادثہ نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ کئی ہفتہ تک میں صاحبِ فراش رہی تھی، نہ عزیزی بھولتی تھی، نہ اس کی جرأت آمیز اور دلیرانہ خودکشی کی واردات جب کبھی میں خاموش بیٹھتی، اس کے الفاظ میرے کان میں گونجنے لگتے،

اس واقعہ کے بعد باسفورس کی سیر کا سلسلہ ختم ہو گیا،

پھر حرم سرا کی رونقیں یعنی وہ پیاری پیاری چھوٹی چھوٹی چڑیاں کبھی میری نظر سے نہیں گذریں، عزیزی کا خیال میرے دل و دماغ پر چھا گیا تھا، عزیزی بالآخر جو سونے کے پنجرے سے آزاد ہو گئی،

بہت دنوں یعنی کئی سال گزرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا عزیزی کا ابن عم، عزیزی کا محبوب، عزیزی کا عاشق، جس رات عزیزی نے سمندر میں ڈوب کر جان دی ہے، ٹھیک اسی رات کو رہزنوں کی ایک ٹولی سے لڑتا ہوا وہ جان نثار بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا، یقیناً ان دونوں کی روحیں جنت الفردوس میں ایک دوسرے سے حقِ وفا ادا کر رہی ہوں گی،

عزیزی کی غرقابی کے بعد احتیاطی بندشیں اور سخت کر دی گئیں، دو کے بجائے چار خواجہ سرا، ایک کشتی پر نگہبانی کے لئے رکھے جانے لگے، لیکن چاند کی

رات کی سیر میں اب میرے لئے کوئی دلکشی نہ رہی، میں نے پھر ادھر کا رُخ نہیں کیا۔

یہ سمندر میری عزیزی کا مقبرہ بن گیا ——— اس کی یہ پر شور لہریں کہیں عزیزی کی ابدی نیند میں خلل انداز نہ ہوتی ہوں! اور یہ چاند اسی لئے برآمد ہوتا ہے کہ میری عزیزی کو تلاش کرے، ——— یہ ہمیشہ اسی طرح اسے تلاش کرتا رہے گا، لیکن وہ نہ ملے گی

ہمیں اس کی اجازت نہ تھی کہ عزیزی کے حادثہ غرقابی و خودکشی کا آپس میں یا کسی سے ذکر کریں، کیونکہ اس "نافرمان" لڑکی کو خدا نے غارت کر دیا تھا! اور بات ختم ہو گئی تھی ——— ہاں بات ختم ہو گئی تھی، دوسروں کے لئے، میرے لئے نہیں، میں کبھی عزیزی کو نہیں بھول سکتی! وہ میرے دل کے گوشہ میں ہمیشہ بسیرا لیتی رہے گی!

---

(۲۹)

شاہ خرچیاں

شعبۂ خوشبویات دوسرے تمام شعبوں سے بڑا تھا اور میں اب یہاں کام کر رہی تھی، یہاں باندیوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی، گلاب، نرگترہ، یاسمین اور دوسرے بہت سے خوشبودار پھول بڑی احتیاط سے جمع کیے جاتے، پھر انہیں صاف کیا جاتا، اس کے بعد انہیں کچلا جاتا، پھر ان کا عرق نکالا جاتا، پھر ان کی خوشبو جذب کی جاتی، پھر انہیں تیل کے ساتھ مخلوط کر دیا جاتا کیونکہ ترکی کے تمام عطر اور تمام خوشبویات تیل ہی پر تیار کیے جاتے ہیں۔

یہ کام خاصا سخت تھا، بعض باندیوں کو تو پھولوں کی سرگرداں رہتے باغ کی روشوں پر کئی کئی گھنٹے گذر جاتے، انہیں پھولوں سے سنیٹ بھی تیار کیا جاتا، غازہ، ہونٹوں کی سرخی، بالوں کی کریم، ہاتھوں کی کریم اور اسی طرح کی دوسری چیزیں اسی کارخانہ شاہی میں تیار ہوتیں۔

حالت یہ تھی کہ ہمارا تپڑا اور ہمارا کمرہ ہر وقت خوشبو میں بسا رہتا اور مہکتا رہتا۔ یہ سنیٹ اور عطر اور تیل اور غازہ سلطانہ کے خاص نسخہ سے تیار کیا جاتا، یہ نسخہ چیف خادمہ کے ہاتھ میں رہتا، کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں جا سکتا تھا۔

مگر کوئی سلطانہ ان تیار کی ہوئی چیزوں کو ناپسند کرتی' وجہ خواہ کچھ بھی ہو نہ اس سے پوچھی جا سکتی تھی نہ وہ بتاتی تھی تو سارا تیار کردہ مال برباد کر دیا جاتا' اس موقع پر ایک اچھی خاصی تقریب کا سر و سامان ہو جاتا' کسلر آغا' چیف خواجہ سراء چیف قادن اور محل سرا کی دوسری عہدہ دار خواتین کی موجودگی میں یہ سامان ضائع کیا جاتا کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہوشیاری اور چالاکی سے کام لے کر اصل چیز جس پر اتنی محنت اور دولت صرف ہوتی تھی' اور دکھاوے کے لئے کوئی اور چیز برباد کر دی جاتی۔

جواہرات کی تراش خراش بھی بالکل سلطانہ کی مرضی پر منحصر تھی' ایسے موقع پر کسلر آغا جوہریوں کو لے کر حاضر ہوتا' سلطانہ اپنے ہاتھ سے ہیرے جواہرات دیکھ کر ان کی تراش خراش کا انداز سمجھاتیں' تیاری کے بعد جب یہ چیزیں سلطانہ کے حضور میں پیش کی جاتیں تو عجیب منظر دیکھنے میں آتا' اگر سلطانہ پر خوش مزاجی کی کیفیت طاری ہوتی تو انعام اکرام جوہری مالا مال کر دیا جاتا' لیکن اگر کسی وجہ سے طبیعت مکدر ہوتی تو ڈیزائن' تراش خراش' کٹنگ ہر چیز رد کر دی جاتی اور فوراً حکم دیا جاتا کہ بحر مارمورا میں کسلر آغا کے سامنے ناپسندیدہ زیورات اور پتھر غرق کر دیئے جائیں۔

(٣٠)

سلطان کا خاص کمرہ

اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ سلطان معظم کے خاص کمرہ کی آرائش وزیبائش کے لئے ایک مشہور خطاط طلب کیا گیا۔

کمرے کی دیواروں پر سنہرے، نیلے، سرخ اور ہرے رنگ میں، قرآن مجید کی آیتیں خط طغریٰ، خطِ غبار، اور خط رقاع میں تحریر کی گئیں ۔ یہ کام کئی سال سے جاری تھا، اور تکمیل کے قریب پہنچا تھا۔

چونکہ اسلام میں تصویروں کا استعمال حرام ہے، لہٰذا مسلمانوں کے گھروں اور مکانوں میں تصویریں یا کسی بھی نہج سے بھی استعمال کرنا سختی سے ممنوع تھا۔ ذوق تصویر کی تکمیل مسلمانوں نے خطاطی کے فن کو کمال تک پہنچا کر کی، چنانچہ سلطان کے کمرہ میں قرآنی آیتیں اس انداز میں تحریر کی گئیں کہ بظاہر ان پر پھول پتی، اور بیل بوٹے کا گمان ہوتا تھا، لیکن نگاہ غور سے دیکھئے تو یہ قرآنی آیتیں تھیں جنہیں مصورانہ کمال کے ساتھ ان خطاطوں نے دیواروں پر، ستونوں پر اور چھت پر اور کارنس پر تحریر کیا تھا اتنی خوبصورت چیز تھی کہ اس کے سامنے بہتر سے بہتر تصویر بھی آرٹ اور حسن و نزاکت کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ——— مختلف

رنگوں کے امتزاج نے اس تحریر میں اور چار چاند لگا دیئے تھے اور اس کی رعنائی زیبائی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی جب تک بالکل پاس جا کر نگاہ غور سے نہ دیکھا جاتا، اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ خطاطی کا کمال ہے، بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی صناع کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں جو دل کا دامن اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔

ایک سلطان کا واقعہ ہے کہ اس کے وزیر اعظم نے جو ایک تعلیم یافتہ اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس سے استدعا کی کہ اس کی شان میں جو قصائد اب تک کہے گئے ہیں وہ کمرے کی دیواروں پر نقش کر دیئے جائیں، سلطان نے اجازت دے دی، لیکن کہا،

"میری خواہش ہے کہ گنبد کا بیرونی حصہ الگ رکھا جائے، کمرہ تیار ہونے کے بعد جو کچھ میں کہوں وہ اس پر نقش کر دیا جائے۔"

کام شروع ہو گیا لیکن وزیر اعظم کے دل میں یہ کھٹک تھی کہ اس اسکیم میں ضرور مجھ سے کوئی خامی رہ گئی ہے۔ جس کا انکشاف بعد میں سلطان معظم کریں گے اور پھر میری خیریت نہیں، وزیر اعظم گھنٹوں اور پہروں اپنے دوستوں، افسروں اور عہدہ داروں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھتا کہ اس راز کا پتہ چلائے مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔

مایوس ہو کر بہ حیثیت وزیر سلطان معظم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا اور دست بستہ ان سے التجا کرتا کہ وہ اس کی غلطی اسے بتا دیں تاکہ اصلاح و تدارک کیا جا سکے۔

سلطان معظم اس درخواست کے جواب میں فرماتے۔

"ابھی نہیں، تمہارا کام ختم ہو جائے تب!"

سلطان کے اس پر اسرار عمل نے وزیر اعظم کو حواس باختہ کر دیا تھا، جب بھی وہ دربار میں طلب کیا جاتا، اپنے لرزتے ہوئے دل سے کہتا۔

"آج ضرور سلطان معظم غلطی مجھے بتائیں گے اور پھر دیکھئے میرا کیا حشر

ہوتا ہے۔" لیکن سلطان نے ایک لفظ بھی گنبد پر نقش ہونے والی تحریر کے بارے میں نہیں کہا جس پر وزیراعظم کے عروج و زوال کا انحصار تھا۔

ہر روز سرکاری کام سے فراغت کے بعد وزیراعظم اپنے دوستوں، افسروں، اور ساتھیوں کو جمع کرتا اور بڑے درد بھرے لہجے میں ان سے کہتا۔

"دوستو! مجھ سے وہ کیا چوک ہوئی ہے، جسے سلطان معظم نے تکمیل آرائش کے بعد بتانے کی دھمکی دی ہے۔ سوچو اور غور کرو۔ اگر ہم خود اسے پالیں تو ممکن ہے عتاب سلطانی سے بچ سکیں۔ ورنہ میں اور میرے ساتھ تم بھی نہ جانے کہاں ہوگے۔ بڑی دیر تک یہ لوگ اس گمشدہ کڑی کو جوڑنے کی کوشش کرتے۔ لیکن وائے ناکامی کوئی بات بھی سمجھ میں نہ آتی۔

آخر وہ دن آیا کہ خطاطوں نے اپنا کام ختم کر لیا صرف گنبد کا وہ حصہ رہ گیا جہاں سلطان کے بتائے جانے والے الفاظ نقش کئے جانے والے تھے۔ وزیراعظم لرزتا اور کانپتا سلطان کے سامنے پہنچا اور قدموں پر گر پڑا۔ اس نے کہا۔

"غریبوں کے والی، دین پناہ، تاجدار والاحشم آپ کے کمرہ کا کام ختم ہوگیا، اپنے اس بدنصیب غلام کو بتا دیجئے کہ اس سے کیا غلطی رہ گئی ہے اور پھر بے شک اس کا سر قلم کر دیجئے، صرف اسی طرح وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ سکے گا۔"

سلطان معظم نے اپنے نجی کاغذات کا ایک صندوقچہ کھولا، کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور کانپتے ہوئے وزیر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے اپنے مرتعش ہاتھوں سے وہ کاغذ پکڑا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ جس میں لکھا تھا۔

"یہ ساری صناعیاں سلطان احمد کے لئے ہیں لیکن نہ یہ باقی رہیں گے نہ سلطان، ایک دن یہ مٹ جائیں گی اور وہ مر جائے گا۔"

وزیراعظم نے یہ الفاظ پڑھے اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سلطان نے کہا،

"وزیرِ اعظم تم میری تعریف میں قصائد پڑھتے ہو اور اسے بھول جاتے ہو، کہ خدا مجھ سے اور سب سے بالا ہے۔ اسکی حمد کرو۔"

وزیرِ اعظم حیران و ششدر گردن جھکا کر باہر نکلا۔ اس کے افسر اور حکام باہر انتظار میں کھڑے تھے۔ ان کے سامنے پہنچ کر بے ہوش ہو گیا۔

---

(۳۱)

رمضان اور عید کی چہل پہل

ہم لوگ حرم سرا کے ڈائننگ روم میں بیٹھے تھے کہ ایک باندی نے آ کر خبر دی،
"چاند ہو گیا ۔۔۔ !"

تھوڑی دیر بعد حبیبہ تا دن آئی، اس نے کہا، کل سے روزے شروع ہیں، آپ کو پابندی کے ساتھ روزے رکھنا پڑیں گے۔ صبح سے لے کر جب تک مغرب کی اذان نہ ہو جائے، کھانا پینا بالکل حرام ہے۔ یہ روزہ ہم سب کے لئے ایک سبق ہے، روزہ رکھ کر ہمیں احساس ہو گا کہ غریبوں پر فاقہ کشی کے عالم میں کیا گزرتی ہے۔

ہماری سہیلیوں میں سے لیلیٰ نے، جو موٹی تازی لڑکی تھی کہا،
"جب تک صبح نہیں ہوتی میں برابر کھاتی رہوں گی، پھر مغرب تک ٹانگیں پھیلا کر سوؤں گی۔"

ایک دوسری سہیلی لل نے کہا۔
"ہاں ٹھیک ہم دن کو رات بنا لیں گے اور رات کو دن!"
ایک اور سہیلی میرا بولی۔
"لیکن میں تو بیمار رہوں، میں کیسے روزہ رکھ سکوں گی!"

میں نے میرا سے پوچھا۔

"تمہاری مٹھی میں کیا ہے؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی "،

"مٹھائی ہے شاید طبیعت ٹھیک ہو جائے۔ تو بیکار کیوں بیٹھوں، اسی سے شغل کرنے لگوں گی۔"

اس کی ان باتوں پر ہم ہنسنے لگے،

رمضان کا مہینہ ہمارے لئے راحت اور آرام کا مہینہ ثابت ہوا، روزہ رکھنا، آرام کرنا، کوئی کام نہ کرنا، ہمارے معمولات میں داخل تھا۔ یہ تیس دن اسی طرح گزر گئے۔ غروب آفتاب کے بعد میزیں بچھا دی جاتیں۔ دستر خوان چن دیا جاتا، انواع و اقسام کی چیزیں سامنے لا کر ڈھیر کر دی جاتیں، پھر جب توپ داغی جاتی تو ہم سب افطار پر ٹوٹ پڑتے۔

رمضان کا آخری ہفتہ بہت زیادہ چہل پہل اور رونق کا ہفتہ تھا اور آخری دنوں کی مصروفیتیں تو بہت زیادہ دلچسپ ثابت ہوئیں، استنبول کی مسجدوں کے اماموں کے جلو میں شاہی گارد کی حفاظت میں سلطان معظم اپنے وزیر اعظم اور دوسرے وزیروں کے ساتھ گشت کے لئے نکلے، اس موقع پر بہت سے پاشا، بے اور درباری وزیروں کی فوج بھی ساتھ تھی۔ یہ سب لباس فاخرہ میں ملبوس عربی گھوڑے پر سوار شان و شکوہ کی تصویر بنے گھوم رہے تھے۔

پیچھے پیچھے سواروں کا ایک مسلح دستہ، پھر سلطان معظم کا اسپ تازی جو موتیوں اور ہیروں سے ڈھکا ہوا تھا، یہ منظر اتنا دلکش تھا کہ جی چاہتا دیکھتے ہی رہیں۔

جو لوگ حجاز مقدس کی زیارت کر آئے تھے اور حج کا فریضہ ادا کر چکے تھے ان کے لئے امتیازی پہلو یہ تھا کہ صرف وہی ہری پگڑیاں استعمال کر سکتے تھے

سلطان معظم جس گھوڑے پر سوار تھے۔ اس کی رکاب، زین، لگام، ہر چیز قیمتی اور خوبصورت موتیوں، ہیروں، زمرد، یاقوت وغیرہ سے جگمگا رہی تھی، سر پر ترکی ٹوپی تھی اور ظل اللہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے۔

عید کے دن شاہی سواری کے پیچھے حرم سرا کی لڑکیاں اور عورتیں بھی شاندار گاڑیوں میں بیٹھ کر عیدگاہ عید ادا کرنے روانہ ہوئیں، سارے راستے میں زندہ باد سلطان معظم کے نعرے ہمارے کانوں میں پہنچتے رہے۔ مجمع کا یہ عالم تھا کہ تھالی پھینکے تو سر ہی سر جائے۔ ہر شخص لباس فاخرہ میں ملبوس، ہر آنکھ عظیم الشان جلوس کی دید میں مصروف، خلقت اس طرح جلوس میں حصہ لے رہی تھی کہ ایک ایک قدم اٹھانے کے لئے کئی کئی منٹ لگ جاتے، ہمارے حجاز میں بھی عید بڑے شاندار طریقہ پر منائی جاتی تھی، لیکن وہاں قسطنطنیہ کی سی شان و شوکت، جاہ و جلال، رعب و وقار کہاں؛

بڑی دیر کے بعد ہم لوگ جامعۂ ایا صوفیہ میں پہنچے۔ ہماری گاڑیاں دروازے سے لگا دی گئیں اور ہم تیزی سے اتر پڑے۔ جوتے دروازہ پر چھوڑے جن کی نگہبانی پر خواجہ سرا موجود تھے۔ سارا منظر اتنا شاندار تھا کہ آدمی ششدر ہو کر رہ جاتا تھا،

جامعہ ایا صوفیہ کے حدود میں داخل ہونے کے بعد سلطان معظم نہ اب جہاں پناہ تھے، نہ شہریار، نہ دنیا کے سب سے بڑے آدمی نہ فاتح اور کشور کشا، یہاں ان کی حیثیت صرف ایک معمولی مسلمان کی تھی۔ اس مجمع کا غریب سے غریب آدمی بھی ان کا بھائی تھا، جس سے وہ مساوات اور برابری کا برتاؤ کرنے پر مجبور تھے، کیونکہ یہ خدا کا گھر تھا اور خدا کی نگاہ میں ہر انسان برابر ہے، خواہ وہ سلطان والا شان ہو یا فقیر بے نوا،

امام کی تکبیروں کے دوران میں ہم نے ایک نظر مسجد پر ڈالی۔ یہاں بھی ہر طرف آیات قرآنی کے طغرے نظر آ رہے تھے۔ یہ نہایت شاندار، مضبوط اور قدیم ترین عمارت تھی، مسلمانوں کے آنے سے پہلے یہ کلیسا تھی، مسلمانوں کے دور حکمرانی میں یہ مسجد

بن گئی۔

یہ شاندار یادگار عمارت قسطنطین اعظم نے بنوائی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک لڑائی میں اُسے بہت نقصان پہنچا تھا، قسطنطین اعظم نے اسے از سرِ نو پہلے سے بھی زیادہ شاندار طور پر بنوا دیا۔ دس ہزار مزدور شب و روز کام کرتے تھے۔ ان مزدوروں میں خود قسطنطین اعظم بھی تھا جب کام ختم ہوا تو قسطنطین اعظم قربان گاہ کے سامنے آیا، اور جذبات سے بے خود ہو کر سربسجدہ ہو گیا اور نعرہ لگایا " اے سلیمانؑ! میں تجھ سے بازی لے گیا"

مسجد میں مختلف مقامات پر قرآن مجید کی آیات پینٹ کی ہوئی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کے خلفاء اربعہ کے نام نامی بھی نقش تھے، عمارت کی وسعت اور بلندی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ہر حرف کئی گز لمبا تھا تب جا کر عمارت کی فراخی اور الفاظ کے قد میں تناسب ہوتا ہے۔

اب عید کی نماز شروع ہو گئی، ہم نے اپنے رُخ کعبہ کی طرف کر لئے اور نیت باندھ لی، نماز سے فراغت کے بعد مجمع کم ہونے کا انتظار بڑی دیر تک کرنا پڑا، پھر ہم گاڑیوں میں بیٹھ کر حرم سرا میں پہنچ گئے ؛

(۳۴)

دربارِ عید

عید کے موقع پر سلطان معظم دربار کرتے تھے، تمام وزرا، حکام، عمال، افسران فوج، معززین شہر، امرا، رؤسا شرف باریابی حاصل کرتے تھے اس موقع پر سلطان کی طرف سے نہایت اعلیٰ پیمانے پر دعوت کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ دعوت اتنی بڑی اور شاندار ہوتی تھی کہ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دو سو باورچی ایک ہفتہ پہلے اس کے اہتمام اور تیاری میں لگ جاتے تھے۔ اس موقع پر عام کھانوں کے علاوہ چند نوایجاد کھانے بھی ضرور ہوتے تھے جس سے تنوع میں بھی اضافہ ہوتا تھا اور کام و دہن کی لذت بھی!! اس موقع پر سلطان معظم ہر وزیر کو کوئی تحفہ بھی عطا فرماتے تھے اس کے بعد والدہ سلطان کی سربراہی میں ملکہ معظمہ کے، پیچھے پیچھے ہم لوگ بارگاہ سلطانی میں حاضری دیتے تھے، یہ شرف حاصل کرنے کے بعد پھر حرم سرا میں واپس آ جاتے تھے، ہماری حاضری کے موقع پر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سلطان کسی باندی سے اپنے حضور میں ناچنے کی یا گانے کی یا ستار بجانے کی فرمائش کرتے۔

سلطان کی یہ فرمائش باندیوں کے جذبات کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیتی۔ پھر سارا دن تیاریوں میں صرف ہوتا اور رات کے کھانے کے بعد سلطان کے سامنے

حرم سرا کی لڑکیوں کا ایک طائفہ گاتا، ناچتا اور ستار بجاتا جس سے وہ محظوظ ہوتے۔ یہ منظر واقعی بڑا سحر آگیں ہوتا۔ ہر قوم اور ملک کی لڑکیاں اس طائفہ میں شامل ہوتیں۔

ان خوبصورت اور طرحدار لڑکیوں کو باندی کہنا بڑا ظلم تھا۔ حسن وجمال، رعنائی وزیبائی، خوبی وخوبروئی، طریقہ اور سلیقہ ہر اعتبار سے ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ انہیں پری کہنا پریوں کی عزت افزائی تھی، لیکن قسمت نے انہیں باندی بنا دیا تھا۔ یہ باندیاں کہلاتی تھیں۔

ویسے کبھی کبھی قسمت ان پر مہربان بھی ہوجاتی تھی۔ اور سلطان زیادہ مہربان ہو کر کسی باندی سے محبت بھی کرنے لگتے پھر اس سے شادی بھی کر لیتے اور اگر کبھی اس اتحاد کے نتیجہ میں کوئی اولاد نرینہ پیدا ہوجاتی تو وہ باندی عملاً ترکی کی حکمران بھی بن جاتی۔ اس لئے کہ سلطان سب کچھ اور بہت کچھ ہونے کے باوجود بہرحال ایک آدمی تھے اور محبت آدمی ہی کرتا ہے۔

چیف قادن جب حرم سرا کی باندیوں کا طائفہ سلطان معظم کی خدمت میں پیش کرتی تو اس سے پہلے خوب اچھی طرح ان کے دانتوں، انگلیوں اور کپڑوں کا جائزہ لیتی۔ ہر چیز ٹھیک پاتی تو چیف خواجہ سرا کے حوالہ کر دیتی اور وہ انہیں رقص گاہ میں پہنچ جاتا۔ جہاں وہ سلطان کے انتظار میں بیٹھ جاتیں۔

---

(۳۳)

وزیرِاعظم کی کہانی

عید کا دن درباری مصروفیتوں سے قطع نظر ویسے بھی لطف و مسرت کا دن ہوتا تھا، ہم آپس میں بھی خوب خوب مزے کی باتیں کرتے، گاتے ناچتے، کہانیاں کہتے، قصے سنتے، نئے نئے کھیل ایجاد کرتے اور کھیلتے،

آج بھی عید کا دن، طرب زائیوں اور نشاط آفرینیوں میں صرف ہوا، ایسا ایسا اودھم مچایا، ہم لوگوں نے کہ بیچاری تاؤن عاجز ہو گئی، آخر تھک کر اُس نے کہا،

خدا کے لئے رحم کرو، اپنے اُوپر نہیں، تو میرے ہی اُوپر سہی، بہت ہرد ہو چکے، اب ذرا آرام کرلو، تھوڑی دیر!

میں نے اور میرے ساتھ کی سہیلیوں نے متفقہ طور پر تاؤن سے کہا،

"جی معاف کیجیے، ہمیں آرام کی ضرورت نہیں، سال بھر کے بعد تو یہ نشاط و مسرت کا دن آیا ہے، اور آپ چاہتی ہیں کہ اُسے بھی ہم چپ کا روزہ رکھ کر گزار دیں،"

اب تاون نے ہمیں "رشوت" پیش کی، اس نے کہا،

"بہت دن ہوئے ایک قصّہ گو سے میں نے ایک کہانی سُنی تھی۔"

کہانیوں اور قصّوں سے تو ہمیں غیر معمولی دلچسپی تھی، فوراً راضی ہو گئے،

"ہاں کہانی تو ہم ضرور سنیں گے،"

تاون نے کہانی شروع کر دی،

"کئی سال گزرے، سلطان کا ایک وزیرِ اعظم تھا حلیم، بڑا موٹا تازہ، اتنا موٹا کہ اس کی عبا تیار کرنے میں پورا ایک تھان صرف ہو جاتا تھا، سلطان اپنے وزیرِ اعظم حلیم کو بہت پسند کرتا تھا، کیونکہ یہ اول درجہ کا مسخرا بھی تھا، ممکن نہ تھا کہ یہ آئے اور کوئی ایسی بات نہ کہدے جس سے سلطان ہنسنے پر مجبور ہو جائیں،

سلطان کی نگاہ میں تو حلیم کا یہ حال تھا لیکن محل کے دوسرے لوگ حتیٰ کہ غلام تک اُسے سخت ناپسند کرتے تھے، اور باندیاں تو اس کی صورت دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھالیتی تھیں، کیونکہ سلطان کا یہ معمول تھا کہ جب زیادہ خوش ہوتا تو وزیرِ اعظم کو تحفہ اور عطیہ کے طور پر ایک باندی ضرور عطا کر دیتا، اور ان باندیوں کا یہ حال تھا کہ بیچاری خوبصورت، طرحدار، البیلے، سجیلے، خوبصورت کشیدہ قامت اور نوجوان شوہروں کا خواب دیکھا کرتی تھیں، بھلا یہ چربی کا تھیلا انہیں کیا پسند آتا جسے دیکھ کر ہی ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، اور دل گھبرانے لگتا تھا، رفتہ رفتہ محل سرا میں وزیرِ اعظم کا نام چھیڑ خانی کا ذریعہ بن گیا جب کوئی لڑکی کسی سہیلی کو چھیڑنا چاہتی تو کہتی۔

"مت گھبراؤ، وہ دن آنے والا ہے، جب سلطان معظم تمہیں تحفہ کے طور پر وزیرِ اعظم کو بخش دیں گے، پھر چین کی بنسی بجانا،"! جاتا

یہ سن کر وہ چیں بہ جبیں ہو جاتی، اور ایسی کھری کھری سناتی کہ لطف آ

ایک مرتبہ ماہ رمضان ختم ہونے کے بعد، حسب معمول، رات کو شاہی دعوت شروع ہوئی تو وزیر اعظم بھی موجود تھا، دسترخوان بچھا اور سلطان کے سامنے وزیر اعظم نے اتنا زیادہ کھایا، اتنا زیادہ کھایا کہ سلطان معظم ہنستے ہنستے لوٹ گئے پھر انہوں نے کیا کیا کہ جب وہ کھا چکتا، ایک نئی پلیٹ اس کے سامنے کھسکا دیتے اور ارشاد فرماتے،

"اور کھاؤ ———— کھاؤ!"

وزیر اعظم بیچارہ انکار نہ کر سکتا، کھانا حلق تک اٹا ہوا تھا، لیکن حکم سلطانی کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی، پھر کھاتا، روتا جاتا، اور کھاتا جاتا، اور سلطان اس کی بے بسی پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے، یہاں تک کہ دسترخوان پر جتنی پلیٹیں تھیں تقریباً سب صاف ہو گئیں، صرف دو ایک بچ رہیں، لیکن اب وزیر اعظم کا یہ حال تھا کہ نہ اس سے بیٹھا جاتا تھا، نہ کھڑا جاتا تھا، اس بری طرح اسکا پیٹ بھرا تھا کہ وہ کچھوے کی طرح بمشکل حرکت کر سکتا تھا،

لیکن سلطان معظم کی تشفی اب بھی نہیں ہوتی، انہوں نے کہا،

"اور کھاؤ کھاؤ!"

بیچارے وزیر اعظم کی حالت دیدنی تھی، اس تازہ حکم پر دوسرے وزیروں اور افسروں نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ اس حکم کی زد سے بچ گئے، ورنہ اگر کہیں ان کو بھی مزید کھانے پر مجبور کیا جاتا تو غضب ہی ہو جاتا، کیونکہ ان کے پیٹ میں اب ذرا بھی گنجائش نہیں تھی، اچھا ہوا بلا وزیر اعظم حلیم پر ٹل گئی،

آخر وزیر اعظم نے پھر ایک پلیٹ صاف کر دی، صاف معلوم ہو رہا تھا، اب اگر اس نے ایک لقمہ بھی کھایا تو پیٹ پھٹ جائے گا،

لیکن سلطان کو رحم نہ آیا،

"نہیں ——— تم ہاتھ نہیں اٹھا سکتے، ابھی اور کھاؤ!"

وزیراعظم نے توند پر ہاتھ پھیرا، اور بڑی بے بسی سے سلطان کی طرف دیکھنے لگا، سلطان نے آہستہ سے کان میں کہا۔

"اگر یہ سارا کھانا جو باقی رہ گیا ہے، صاف کر دو تو ایک نہایت خوبصورت اور نوجوان لونڈی تمہیں بخش دوں گا!"

یہ لالچ کام آیا، اور بسم اللہ کر کے وزیراعظم نے سارا کھانا صاف کر دیا، اب اس غریب میں اٹھنے کی سکت بھی باقی نہ رہ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے دس خواجہ سراؤں نے یہ لاش اٹھائی، تب بڑی مشکل سے اس نے جنبش کی،

دوسرے روز سلطان کو اپنا وعدہ یاد آیا وہ بہت زیادہ وزیراعظم کو ستا کر محظوظ ہو چکا تھا، اب انعام کا وقت تھا، اس نے وزیراعظم حلیم کو بلایا، اور اپنی ایک نہایت حسین و جمیل باندی، عذرا، اسے عطا کر دی

عذرا اتنی ہی نازک اندام، خوبصورت اور سحر طراز تھی، جتنا حلیم، موٹا بھدا اور بد صورت تھا،

اس عطیہ میں بھی سلطان نے لطف و تفریح کا پہلو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

کہاں حلیم کا سایہ نما اور بدہیئت شخص، کہاں عذرا کی سی پری پیکر، دونوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا، لیکن یہی بے جوڑ منظر دیکھنے اور اس سے لطف لینے کے لئے سلطان نے داد و دہش کا مظاہرہ کیا تھا، بیچاری عذرا میں مجال دم زدن نہ تھی۔

——— سلطان سلطان تھا، اور باندی باندی! اس کے ہر حکم کی تعمیل لازمی تھی، اور یہ ہر حکم کو بے چون و چرا ماننے پر مجبور تھی،

سلطان کی حد تک تو یہ مذاق "ختم" ہو چکا تھا، لیکن یہاں سے کم از کم عذرا کے لئے ایک نئی ٹریجڈی کا آغاز ہوا! اس نے، اس نئے آقا کو قبول تو کر لیا،

لیکن دل سے نہیں، صرف زبان سے! اور اگر دل سے تو ٹوٹے ہوئے دل سے!

وزیر اعظم حلیم کی تین بیویاں پہلے سے موجود تھیں، اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ تین بیویاں اپنی پری پیکر سوکن کو دیکھ کر کیا رائے قائم کریں گی! اور اس سے کس طرح کا برتاؤ کریں گی؟ ——— ان تینوں سے بہت سال ہوئے جب اس نے شادی کی تھی، شادی کے وقت وہ بھی جوان تھا، اور یہ تینوں بیویاں بھی، لیکن اب وہ بھی بوڑھا ہو چکا تھا، اور یہ بیویاں بھی بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو چکی تھیں، اس نئی رفیقۂ حیات کے پانے سے وہ تو بہرحال بہت خوش تھا، سابقہ تین بیویوں پر کیا گزرے گی، اس سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا،

سلطان نے عذرا کو بخشتے ہوئے حلیم سے تاکیداً کہہ دیا تھا کہ،

"تمہیں عذرا سے شادی کرنا پڑے گی!"

گویا چار بیویوں کی تعداد اس نئی شادی کے بعد پوری ہو جاتی،

بڑے شوق اور جوش کے عالم میں حلیم نے عذرا سے شادی کر لی، اتنی دھوم دھام سے کہ کیا کوئی نوجوان آدمی اس طرح اپنا گھر بسائے گا،

حلیم کی تینوں بیویاں آپس میں ایک دوسرے سے لڑا کرتی تھیں، جلا کرتی تھیں، لیکن عذرا کے مقابلہ میں انہوں نے متحدہ مورچہ بنا لیا، کیونکہ یہی وہ ہستی تھی جس نے ان کے سکون و اطمینان کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دی تھی،!

---

(۳۴)

عذرا

عذرا بھی بڑی ہوشیار اور چالاک تھی چند ہی روز میں اس نے اپنے شوہر وزیر اعظم حلیم کو اپنا بندۂ بے دام بنا لیا، وہ اس طرح بن سنور کر اور سولہ سنگار کر کے اس کے سامنے آتی کہ وہ مسحور ہو جاتا، اور اپنے آپ کو اس کی فرمائش پوری کرنے اور ہر حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور پاتا، عذرا کے اس اقتدار نے تینوں بیویوں کو اور زیادہ درد دل میں مبتلا کر دیا، وہ انگاروں پر لوٹنے لگیں، جہاں حلیم عذرا کا چہرۂ زیبا دیکھ کر، اس کے ناز و انداز کے سامنے سر بسجود ہو جاتا، وہاں اس کی تینوں بیویاں یہ دل فگار منظر دیکھ کر جان سے بیزار ہو جاتیں اور طرح طرح کی سازشیں کرنے لگتیں۔

اب صورت حالات یہ تھی کہ حلیم تو ہزار جان سے عذرا پر فریفتہ تھا، لیکن یہ کیفیت تھی کہ گو اسے قابو میں رکھتی، لیکن اسے زیادہ منہ نہ لگاتی، اس کا برتاؤ بوڑھے نکمے، اور بھدے شوہر کے ساتھ وہی تھا، جو ایک حسین و جمیل نوجوان اور الھڑ بیوی کا ایسے شوہر کے ساتھ ہونا چاہیئے، بہت جلد حلیم کو تارے نظر آنے لگے

تینوں بیویاں الگ اس سے نفور، اور دُور دُور رہتیں اور عذرا اُسے منہ نہ لگاتی
اب تک اس کی زندگی آرام و سکون سے بسر ہوتی چلی آئی تھی، اب سوا اضطراب
اور بےقراری کے اس کے پاس کچھ نہ رہ گیا تھا،

ایک طرف تو عذرا شوہر کو زیادہ سے زیادہ منہ نہ لگاتی، دوسری طرف
اس نے اُسے رام رکھنے کے لئے ساری ذمہ داریاں بھی اپنے ذہنِ ناتواں پر لے رکھی
تھیں، پائپ وہی سلگاتی، شربت وہی پیش کرتی، کبھی کبھی تو اس کے پاؤں تک داب
دیتی، کبھی ترنگ میں ہوتی تو ستار لے کر بیٹھ جاتی اور بوالہوس شوہر کے سامنے
نغمے بکھیرنے لگتی، یہ ساری باتیں تینوں بیویوں کو کھلتیں، وہ اس کا گانا سُن کر کانوں
میں انگلیاں دے لیتیں، اس کی باتیں سُن کر جل جاتیں، اس کی قدر و وقعت سے سلگنے
لگتیں، اور اس کے خلاف سازش میں مصروف ہو جاتیں کہ کسی طرح بھی اسے نیچا
دکھائیں ——— ویسے بھی ایک عورت تن تنہا کیا کچھ نہیں کر سکتی، اور
جب ایک چھوڑ تین تین عورتیں کسی کام پر تُل جائیں، اور حریف کو نیچا دکھانے
کا فیصلہ کرلیں تو ان کی مار کون کھا سکتا ہے۔ ———— ؛

یہ دیکھتی تھیں کہ حلیم کی دولت بے دریغ عذرا پر صرف ہو رہی ہے،
ہر روز اس کے لئے نئے نئے زیورات بن رہے ہیں، قیمتی ملبوسات تیار
ہو رہے ہیں، اعلیٰ درجے کے عطریات اور خوشبویات کا اہتمام کیا جا رہا ہے، اس کے
لئے اس کا بس چلتا تو عذرا کو زہر دے دیتیں، یا اس کا گلا گھونٹ دیتیں، حلیم کے
حرم سرا میں ہر وقت۔ کرچک بیگم" (چھوٹی بیگم) کے خلاف سازشیں ہوتی رہتیں،
حلیم ان باتوں سے بے خبر تھا، وہ اگرچہ چار بیویوں کا شوہر تھا، لیکن عورت
کی فطرت سے ناواقف تھا، خود عذرا ویسے تو بڑی چنچل اور چرنچال تھی، لیکن وہ
بھی اس سے بے خبر تھی کہ اس کی تباہی کے لئے کیا کچھ سوچا جا رہا ہے؛

حلیم چونکہ بوڑھا اور بدصورت تھا، اور عذرا، نوجوان اور خوبصورت تھی اس لئے بہت زیادہ شکی ہو گیا تھا ——————— !

ایک روز اس کی پہلی بیوی حسنیٰ نے باتوں باتوں میں اس سے کہا۔

"کچھ اور بھی سُنا آپ نے؟"

حلیم نے پُوچھا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟"

وہ بڑی سادگی اور معصومیت سے بولی،

"کوئی خاص بات تو نہیں، ہاں، آج ایک نوجوان شخص عذرا سے ملنے آیا تھا"

وہ چونک پڑا،

"عذرا سے ملنے ایک نوجوان شخص آیا تھا؟"

وہ کہنے لگی،

"ہاں دیکھنے میں تو نوجوان ہی تھا، شاید بوڑھا ہو"

حلیم نے پریشان ہو کر پوچھا،

"کون تھا وہ؟"

حسنیٰ نے سادگی کے ساتھ کہا،

"میں کیا جانوں، ہو گا کوئی، چاہو تو خود عذرا سے پُوچھ لو!"

یہ وار کام کر گیا حلیم کا دماغ معطل ہو گیا، اس نے فوراً ایک غلام کو عذرا کی جاسوسی پر مامور کر دیا، اس نے کئی باندیوں کو انعام کا لالچ دے کر ان سے کہا کہ عذرا جہاں بھی اور جب بھی ملے اس کی نگرانی رکھیں، اس کی باتیں سنیں اور رپورٹ دیں۔

اب تو حلیم پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی،

وہ سلطان کے محل میں جاتا، اپنے دفتر میں بیٹھتا، لیکن عذرا اور اس نامعلوم شخص کی تصویر اس کے دماغ میں گھومتی رہتی، وہ ہر آن اس کا منتظر رہتا کہ اب خبر ملے گی کہ وہ شخص اور عذرا پائیں باغ میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، اور یہ سنتے ہی وہ جائے گا اور اس رقیب روسیہ کی گردن قلم کر دے گا، کبھی ایسا ہوتا کہ عذرا کی بے وفائی اور اس کے نامعلوم عاشق کا خیال کر کے رونے لگتا، تھوڑے دنوں میں اس کی یہ حالت ہو گئی، کہ جو ہر وقت سلطان معظم کو ہنسایا کرتا تھا، ہر وقت روتا رہتا، آنسو بہہ بہہ کر اس کے رخسار پر ڈھلکنے لگتے ——— !

ادھر چند روز سے وہ اتنا پریشان اور مضطرب تھا کہ دو دن سے اس نے ایک لقمہ تک نہ کھایا تھا کہ ایک جاسوس حاضر ہوا، اس نے کہا،

"میرے آقا میں نے ابھی ان آنکھوں سے دیکھا ہے ———

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا، معلوم ہوتا تھا کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن تامل کر رہا ہے۔

حلیم نے کہا۔

"چپ کیوں ہو گیا ہے احمق کے بچے، کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے ———

——— یاد رکھ اگر جھوٹ بولا تو تیری آنکھیں اندھی کرا دوں گا!"

وہ کہنے لگا،

"میرے آقا، میں نے دیکھا کہ ایک غیر ملکی آدمی عذرا خانم کے کمرہ میں گیا۔

———

یہ سنتے ہی حلیم دیوانہ وار لپکا، سیدھا اپنی حرم سرا پہنچا، اور دوڑتا ہوا عذرا کے کمرہ میں پہنچ گیا، یہاں ایک شخص مردانہ لباس میں بیٹھا عذرا سے باتیں کر رہا تھا، حلیم نے تلوار نکال لی جب قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ

کوئی مرد نہیں اس کی سرگیشیا کی رہنے والی ایک باندی ہے۔

حلیم نے پوچھا۔

"یہ کیا؟"

وہ بولی،

"کھیل ——— مذاق ——— اس سازش کا جواب جو میرے خلاف ہو رہی ہے!"

حلیم پہلے تو خاموش ہو گیا، پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا کہنے لگا،

"بڑی ذہین اور بڑی شریر ہو عذرا تم!"

اس طرح حسنی بیگم کی سازش ناکام ہو گئی،

ہم لوگوں نے بڑے انہماک اور توجہ سے چھیف تاذن کی یہ کہانی سنی، پھر وہ کہنے لگی،

"اب جاؤ سو رہو ——— صبح تمہیں جلد اٹھنا ہے۔"

میں نے پوچھا،

"یہ کس لئے؟"

وہ کہنے لگی،

سلطان معظم صبح اپنے افواج قاہرہ کا معائنہ کریں گے اور اس موقع پر تم لوگوں کو بھی موقع دیا جائے گا کہ ان کا دیدار کر سکو ——— !

ہم لوگ خوش ہو گئے،

حرم سرا سے باہر جانے کا ایک اور موقع قسمت نے عطا کیا تھا،

دوسرے دن صبح تڑکے ہم سب اٹھ بیٹھے، نہا دھو کر لباس تبدیل کیا، اور اس شاندار تقریب میں شرکت کے لئے تیار ہو گئے،

تھوڑی دیر کے بعد چیف قادن آئی، پھر خواجہ سراؤں کی معیت میں ہم باہر نکلے اور شاندار شاہی گاڑیوں پر سوار ہو کر اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے! ——————

(۳۵)

فوج کی سلامی

سپاہ کے معائنہ کا منظر بے حد دلچسپ اور ولولہ آفریں تھا، پیادوں اور سواروں کے دستے اپنے زرق برق لباس اور شاندار وردی میں اتنے بھلے معلوم ہوتے تھے کہ کیا کہوں ایک طرف توپ خانہ سپاہیوں کی دو بہت بڑی قطاروں کے ساتھ موجود تھا۔

جیسے ہی سلطان معظم کا چہرہ پر انور نمودار ہوا، دفعتہً سپاہیوں نے اور ان کے ساتھ مل کر خلقت نے نعرہ لگایا۔

"زندہ باد سلطان معظم!"

سلطان معظم ایک سیاہ رنگ کے عرب گھوڑے پر سوار تھے، ان کے پیچھے پیچھے گرانڈ ماسٹر آف دی آرٹیلری تھا، خلقت بار بار پُر زور جوش و خروش کے ساتھ نعرے لگا رہی تھی، حقیقت یہ ہے کہ سلطان معظم کو دیکھنے کے بعد جوش عقیدت کا رو کنا بس کی بات نہیں تھی،

سلطان کی سواری کے پیچھے پیچھے، مارشل، جنرل، کرنل، قصر سلطانی کے حکام د

اُمراٗ، وزراٗ اور دوسرے بلند مرتبت اصحاب چل رہے تھے۔

اس موقع پر فوج میدان میں حاضر تھی، اس کی تعداد سپاہیوں اور افسران سمیت کسی طرح بیس ہزار سے کم نہیں تھی۔

اس موقع پر سواروں نے جو کرتب دکھائے وہ بھی حد درجہ دلچسپ تھے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر اسے سرپٹ دوڑانا زین پر دونوں پاؤں سے کھڑے ہو کر گھوڑے کے دوڑنے کے دوران میں قلابازی کھانا، گھوڑے پر بیٹھے ہوئے نیچے زمین پر کھڑے آدمیوں میں سے کسی کو اچک لینا، دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو جانا، یہ ایسے کرتب تھے۔ جنہیں دیکھ دیکھ کر لوگ عش عش کر اُٹھتے تھے۔

اس کے بعد تمام سپاہی دو بڑی بڑی قطاروں میں تقسیم ہو گئے، سلطان ذیشان ان قطاروں کے درمیان سے گزرے، مختلف سپہ داروں سے بات چیت کی، جب بالکل آخری کونے پر پہنچے تو انہیں سلامی دی گئی، ہوا میں توپیں داغی گئیں، پھر سلطان والاشان، اپنے وزیروں، افسروں، حاکموں اور دوسرے عہدے داروں کے جلو میں محل واپس تشریف لائے، پھر محل میں سلطان معظم کی طرف سے ایک شاندار اور یادگار ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔

دوسرے روز وزراٗ، متعینان کرام، شیوخ عظام اور شہر کے تاجروں اور صنعت کاروں کی طرف سے سلطان معظم کی خدمت میں تحائف نذر گزرانے گئے، یہ لوگ درباری لباس میں ملبوس تھے، دربار عام کے ہال میں یہ حاضر ہوئے، یہاں اپنے تحائف پیش کر کے یہ واپس چلے گئے۔ ان لوگوں کی مسرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کہ انہوں نے سلطان عالم پناہ کے چہرۂ انور کی زیارت کر لی۔

اس کے بعد شہر کے فقیروں، اندھوں، بہروں، گونگوں، لنگڑوں، اور لنجوں کا جلوس وزیر کے باغ میں پہنچا، یہاں ان لوگوں کو روپے تقسیم کئے گئے، کپڑے دیئے گئے، ان کی فرمائشیں پوری کی گئیں، پھر پھل، مٹھائی اور شربت سے ان کی تواضع کی گئی -

(۳۶)

درویش

درویشوں کا ایک گروہ بھی سلطان معظم کو دعائے درازیٔ عمر و ترقی اقبال کے لئے پہنچا، یہ عجیب باہمہ اور بے ہمہ لوگ تھے، نہ زرداروں کے نیاز مند نہ بے زروں سے نفور، اپنے حال میں مست، سب سے الگ، سب سے جدا، زندگی کی راحت و آسائش سے انہیں سروکار نہ تھا، ان میں سے بعض کے بارے میں مشہور تھا کہ پریوں اور فرشتوں سے بات چیت پر قادر ہیں، بعض ایسے تھے جو عام لوگوں سے بلکہ کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے، ہمیشہ خاموش رہتے تھے، سنسان جنگلوں میں زندگی بسر کرتے تھے یا ایسے گوشۂ حکومت میں رہتے جہاں پرندہ پر نہ مار سکے، ان کی غذا، درختوں کی چھال، پھول پتے، اور جنگلی پھل تھے، دُنیا کی کسی چیز سے یہ کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رکھتے تھے، کچھ ان میں ایسے تھے جو ہمیشہ سفر میں رہتے تھے، آج یہاں ہیں، کل وہاں ہیں، لیکن کسی کے سامنے دستِ سوال نہ دراز کرتے ادھر ادھر سے جو پھل پھلواری دستیاب ہوجاتی، یا از خود کوئی زبردستی کر کے کھانا لاکر سامنے رکھ دیتا یہ کھا لیتے، اور خدا کا شکر ادا کر کے پھر ایک نئی منزل

کی طرف چل کھڑے ہوتے۔

ان درویشوں کا ایک بڑا طائفہ ایسا بھی تھا، جو صرف خانقاہوں، اور زاویوں میں زندگی بسر کرتا تھا، اور ان حدود سے باہر قدم نکالنا گناہ سمجھتا تھا خیرات و صدقات کی رقمیں اور چیزیں خود بخود بن مانگے یہاں پہنچ جاتیں، اور اُن کے کھانے پینے کا بندوبست ہو جاتا،

یہ درویش بڑے قانع اور متوکل ہوتے اور اپنے پیر و مرشد کا ادب احترام توحد درجہ ملحوظ خاطر رکھتے، ان کا لباس عام طور پر لمبا کرتہ اور ایک نوکدار پگڑی ہوتی، جس کے نیچے بعض لوگ کلاہ استعمال کرتے، بعض اس کی ضرورت نہ محسوس کرتے، صبر، عاجزی، خاکساری، خاموشی، ان کی فطرت تھی، مرشد کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہ کرتے، گردن جھکی رہتی اور آنکھیں نیچی رکھتے،

سلطان عالاالشان، ان سب درویشوں کی زیادہ سے زیادہ اعانت فرماتے، اور بیش قرار رقمات عطا کر کے انہیں نوازتے،

---

(۳۷)

میری ترقی میرا عروج

حرم سرا میں داخل ہوئے مجھے ڈیڑھ سال کی مدت گزر چکی تھی!

اس عرصہ میں حرم سرا کے آداب، قاعدے ضابطے، اصول، رسم و رواج ہر چیز سے واقفیت حاصل کر لی تھی، جو کام میرے سپرد کیا گیا، میں نے خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اسے انجام دیا، کبھی کسی معاملہ میں غفلت یا فرض ناشناسی کا ثبوت نہیں دیا، نہ اپنی بالادست خواتین کو کسی جائز شکایت کا موقع دیا۔

والدۂ سلطان شروع ہی سے مجھ پر مہربان تھیں، میری صورت انہیں بہت بھاتی تھی، میرے طور طریقے، انہیں بہت پسند تھے، جس ذہانت کا ثبوت میں نے ترکی زبان سیکھنے اور حرم سرا کے رسم و رواج سے واقف ہوتے ہی دیا تھا، اس سے بھی وہ بہت متاثر تھیں، یہی وجہ تھی کہ بار بار مجھے "ترقی" کے مواقع ملتے رہے، جس شعبہ میں بھی گئی، وہاں وقار و تمکنت کے ساتھ رہی، اور پھر جب کسی دوسرے شعبہ میں ترقی پا کر منتقل ہوئی تو پہلے سے زیادہ اعزاز و عزت کی نعمت مجھے حاصل ہوئی۔

اب پھر مجھے ترقی ملی! !

اور میں "مناسبات" کی انچارج بنا دی گئی یعنی حرم سرا میں جتنے بھی شعبے اور محکمے تھے، میں ان سب کے درمیان واسطہ اور ذریعہ بن گئی۔ بغیر میرے توسل اور وساطت کے نہ کوئی اسکیم بار آور ہو سکتی تھی، نہ کوئی پروگرام طے پا سکتا تھا، نہ باہمی طور پر صلاح و مشورہ کے بعد کوئی خاکہ تیار کیا جا سکتا تھا، جو عرضداشتیں آگے بڑھانا ہوتیں، یا جن معاملات کا تصفیہ باہر سے یعنی وزیر اعظم سے کرانا ہوتا، وہ بھی میرے ہی ذریعہ سے ہوتا۔

اس نئے منصب پر فائز ہونے کے بعد سب سے پہلے، مجھے وزیر اعظم کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا، کیونکہ اب میرا اور ان کا واسطہ تمام معاملات میں ضروری تھا، میں چیف کا اشارہ پا کر چند خواجہ سراؤں کی معیت میں وزیر اعظم کے دفتر میں حاضر ہوئی، یہ ایک نیک اور شریف اور متواضع آدمی تھے، ان کا دفتر کیا تھا، اچھا خاصا محل تھا، سامانِ آرائش دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی تھیں، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتی، وہ تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ ملے، انہوں نے فرمایا،

"اس ترقی پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، نشاط خانم!"

"میں نے ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ آپ کی بندہ پروری ہے'!"

وزیر اعظم نے فرمایا۔

"آپ کو جب ضرورت ہو، میرے پاس آ سکتی ہیں، جب کوئی اہم معاملہ فیصلہ طلب ہو، اور اس میں میرے مشورہ اور صلاح کی ضرورت ہو تو بے تامل آپ مجھے اطلاع دے سکتی ہیں!"

میں نے عرض کیا۔

"اس نوازش کی دل سے مشکور ہوں!"

وزیرِ اعظم نے فرمایا۔

"اگر کام زیادہ ہو تو آپ اپنی مددگار کے طور پر جتنی خادمائیں رکھنا چاہیں میں ان کا بندوبست کر دوں؟"

میں نے جواب میں کہا،

"ابھی فی الحال تو اس کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر کام بڑھا، اور ضرورت محسوس ہوئی تو ضرور گوش گذار کر دوں گی!"

وزیرِ اعظم نے فرمایا،

"حرم سرا کے اصول، اور قاعدوں سے تو آپ اچھی طرح واقف معلوم ہوتی ہیں، یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی!!"

یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی، میں نے کہا۔

"میری کوشش تو یہی رہی ہے کہ کوئی کوتاہی آداب و رسوم کے سلسلہ میں نہ رہنے پائے!"

پھر بڑی دیر تک وہ اخلاق اور عنایت کی باتیں کرتے رہے اور میں رخصت ہو کر اپنے کوشک میں واپس آگئی!

اب تک محلسرا میں میری زندگی باہمہ اور بے ہمہ تھی، کسی کی برائی سے مجھے واسطہ نہ تھا، بھلائی میں سب کی شریک تھی، سازش کا لفظ میں نے سنا ضرور تھا، لیکن یہ کیا بلا ہوتی ہے، مجھے بالکل نہیں معلوم تھا۔

لیکن میری یہ ترقی، بہت جلد میں نے محسوس کر لیا میری بعض بہنوں کو کھل رہی ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ میرے خلاف "سازش" میں مصروف بھی ہیں شروع شروع میں یہ باتیں سن کر مجھے بہت تشویش ہوئی، اس لئے کہ گو

میں عروج اور ترقی کے راستہ پر گامزن تھی لیکن یہاں میرا خدا کے سوا کوئی سہارا اور آسرا نہ تھا، عزیزی میری چہیتی سہیلی تھی، وہ سمندر میں کود کر اپنی جان دے چکی تھی، میری ہمدرد، غم خوار، دمساز وہی تھی، اور اب اس کے بعد میں اپنے آپ کو بالکل تنہا، بالکل بے سہارا اور بے آسرا محسوس کرنے لگی تھی، وہ اگر زندہ ہوتی تو شاید ان سازشوں کا تدارک کر سکتی، شاید مجھے کوئی معقول مشورہ دے سکتی لیکن وہ اب جنت میں مزے کر رہی تھی، سارا بوجھ، ذمہ داریوں کا، اور دشمنوں کی دراندازیوں کا میرے دوش ناتواں پر آن پڑا تھا، میں نے بھی ہمت نہیں ہاری محنت، سچائی اور مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے لگی، نتیجہ خدا پر چھوڑ دیا، ایک بات پر بہت سختی سے میں قائم تھی، یہ کہ کسی کے خلاف سازش نہیں کروں گی، کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گی، اور کوئی ایسی بات نہیں کروں گی، جس پر بعد میں مجھے پشیمان ہونا پڑے!

اندر کا حال تو خدا جانے، لیکن بظاہر میں نے ایسا محسوس کیا کہ جو طوفان میرے خلاف اٹھتا نظر آرہا تھا، وہ دب گیا!

میں نے خدا کا شکر ادا کیا،

---

(۳۸)

شطرنج

نئے منصب پر فائز ہونے کے بعد مجھے ایک اور اعزاز حاصل ہوا، !
اب میں والدۂ سلطان کی مصاحب بن گئی ۔ مجھے اختیار تھا کہ جب جی چاہے ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں ، اب تک ان کی خدمت میں اگر مجھے شرف حضوری حاصل ہوتا تھا، تو چیف قادن کے ذریعہ ، لیکن اب بلا روک ٹوک میں ان کی بارگاہ میں پہنچ سکتی تھی ، اس منصب کے اعتبار سے مجھے یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ جب والدۂ سلطان شطرنج کھیلنا چاہیں تو میں بھی ان کے ساتھ کھیلوں ؛

شطرنج کا کھیل مجھے اچھی طرح آتا تھا، اپنے گھر پر بھی والد مرحوم کے ساتھ میں خوب کھیلا کرتی تھی ، میری چالیں دیکھ کر ایک دفعہ وہ کہہ اٹھے ،

"میری لڑکی ایک دن شطرنج کی دنیا میں بہترین کھلاڑی ہو گی !"

ہمارے گھر میں جو شطرنج تھی ، وہ بہت معمولی قسم کی تھی ، لیکن والدۂ سلطان کے پاس جو شطرنج میری نظر سے گذری اُسے دیکھ کر تو میری آنکھیں کھل گئیں ، سارے مہرے ہاتھی دانت کے بنے ہوئے تھے ، اور ان میں یاقوت ، زمرد ، نیلم ، پکھراج

اور دوسرے قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے، بساط بھی بہت خوبصورت اور دیدہ زیب تھی، جی چاہتا تھا بس دیکھتے ہی رہو،

پہلے ہی دن کے کھیل میں میں نے اندازہ کر لیا کہ والدہ سلطان کو شطرنج کا شوق تو ہے۔ لیکن وہ کچھ اچھی کھلاڑی نہیں ہیں، میں نے کچھ زیادہ توجہ کھیل میں صرف نہیں کی، پھر بھی بازی میرے ہی ہاتھ رہی، وہ بہت سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ چال چلتی تھیں، تین گھنٹے میں ہم صرف دو بازی کھیل سکے، لیکن اس پہلے کھیل میں جہاں میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ والدہ سلطان نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ یالا جس لڑکی سے پڑا ہے وہ آسانی سے ہار ماننے والی نہیں۔

میری دو تین تابڑ توڑ چالیں دیکھ کر والدہ سلطان مسکرائیں اور انہوں نے ارشاد فرمایا،

"نشاط خانم تم تو بہت اچھا کھیل لیتی ہو؟"

میں نے عرض کیا،

"جی ہاں۔ تھوڑا بہت کھیلنا آتا تو ہے ——— !"

انہوں نے دریافت کیا

"یہ کھیل تم نے کہاں سیکھا؟ کیا یہیں حرم سرا میں؟"

میں نے عرض کیا۔

"جی نہیں ——— وطن میں، گھر پر میرے والد شطرنج کے بڑے شوقین تھے، انہی نے یہ کھیل مجھے سکھایا تھا؟"

والدہ سلطان نے پوچھا،

"کیا تمہارے والد زندہ ہیں؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر عرض کیا،

"جی نہیں ان کا انتقال ہو گیا!"

والدۂ سلطان نے بھی ایک ٹھنڈی سانس لی، اور فرمایا،

"دنیا اسی کا نام ہے ـــــــــ یہاں زندگی اور موت کا کھیل اسی طرح جاری رہتا ہے، آج خوشی ہے تو کل ماتم، کہیں جشن نشاط ہوتا ہے، کہیں سے فریاد رشیون کی دلدوز صدائیں بلند ہو رہی ہیں!"

والدۂ سلطان نے بساط ایک طرف کھسکاتے ہوئے کہا،

"نشاط خانم ـــــــــ اس محلسرا میں تم خوش تو ہو؟"

میں نے عرض کیا۔

"مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے کہ آپ کے قدموں تلے زندگی بسر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، خدا آپ کو ہمیشہ زندہ رکھے اور زندگی بھر میں آپ کے سایۂ عاطفت میں رہوں!"

میرے ان الفاظ سے والدہ سلطان بہت متاثر ہوئیں، کہنے لگیں،

"تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے ـــــــــ؟"

میں نے دست بستہ عرض کیا،

"جی نہیں ـــــــــ بھلا آپ کے زیر سایہ رہ کر تکلیف بھی ہو سکتی ہے کسی کو؟"

کہنے لگیں۔

"اگر کوئی شکایت ہو کوئی ضرورت ہو، بے تامل مجھ سے کہہ دیا کرو!"

میں نے عرض کیا،

"آپ سے نہ کہوں گی تو اور کس سے کہوں گی!"

والدۂ سلطان کا یہ معمول تھا کہ شطرنج کھیلتی جاتی تھیں، اور حرم سرا کے

مختلف لوگوں اور مختلف معاملات کے بارے میں گفتگو کرتی جاتی تھیں، کبھی بےحد خوش اور مسرور نظر آتیں، تو سوالات بھی اس نوعیت کے ہوتے، کبھی افسردہ اور دلگیر، بلکہ کسی حد تک برہم اور خشمگیں نظر آتیں، تو سوالات میں بھی اعتراض اور طنز کا رنگ جھلکتا۔ میرا معمول تھا کہ جو بات وہ پوچھتیں بےکم وکاست میں سچ سچ بیان کر دیتی، کچھ اس لئے کہ میرے منصب کا تقاضہ یہی تھا، اپنے سے برتر اور اعلےٰ شخصیتوں کو صحیح حالات سے باخبر رکھوں، اور والدۂ سلطان سے بڑھ کر برتر اور اعلیٰ شخصیت اور کس کی ہو سکتی تھی، اور کچھ اس لئے کہ طبعاً میں جھوٹ بولنے سے کتراتی تھی، اور سچی بات میرے منہ سے نکل جایا کرتی تھی،

مجھے کیا معلوم تھا کہ حرم سرا کی قادن اور دوسری منصب دار عورتوں نے اپنے جاسوس ہر طرف چھوڑ رکھے ہیں، حتیٰ کہ والدۂ سلطان کی بارگاہ بھی ان سے خالی نہیں ہے، والدۂ سلطان کو کسی کا ڈر تو پڑا نہیں تھا کہ وہ مجھ سے سرگوشیاں کرتیں، میں بھی صفائی کے ساتھ جواب دے دیتی، ان کا سوال اور میرا جواب، بارگاہ میں موجود باندیوں کے کان میں بھی پڑتا، یہ سوال جواب کبھی اس نوعیت کے ہوتے کہ ان کی زد براہِ راست، چیف قادن یا دوسری منصب دار خواتین پر کسی حد تک پڑتی، ان باندیوں میں جو بارگاہ میں حاضر رہتیں، کچھ جاسوس تھیں ——— میں نہیں جانتی وہ کون تھیں؟ ——— اور یہ جاسوس باندیاں، ایک ایک بات، مجھے یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ نمک مرچ لگائے بغیر چیف قادن سے کہہ دیتی تھیں،

ایک روز، جب میں والدۂ سلطان کے پاس سے شطرنج کھیل کر آئی، تو چیف قادن میرا انتظار کر رہی تھی، میں نے کہا،

"خیریت تو ہے آپ یہاں کہاں؟"

وہ کہنے لگی،

ایک ضروری بات تمہارے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں!

میں نے کہا،

"فرمائیے میں سن رہی ہوں!"

وہ بولی،

"والدۂ سلطان جو کچھ تم سے پوچھیں کیا ضروری ہے کہ ساری تفصیلات جناب میں بیان کر دیا کرو؟"

یہ سنکر مجھے بڑی حیرت ہوئی، میں نے کہا،

"آپ کا مطلب کیا ہے؟"

وہ کہنے لگی،

"مطلب یہ ہے کہ والدۂ سلطان کے سامنے حرم سرا کے حالات تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں!"

میں نے اعتراض کیا،

"لیکن وہ پوچھتی جو ہیں!"

قادن نے کہا۔

"پوچھنے دو ——— جو وہ پوچھیں اس کا گول مول جواب دیدو اگر تم اسی طرح صاف گوئی سے کام لیتی رہیں، تو جانتی ہو انجام کیا ہوگا؟"

میں نے سہم کر پوچھا،

"بتائیے کیا ہوگا انجام؟"

قادن نے بتایا،

"تم یا تو سازشوں کی زد میں آکر ذلیل و رسوا ہو کر معزول کر دی جاؤ گی

یا ممکن ہے کوئی زبردستی قصہ ہی تمام کر دے ——— لہٰذا میرا دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ جواب ہمیشہ ایسا دو، جس کے دو پہلو ہوں، تاکہ سلطان بھی اپنے سوال کا جواب پا لیں اور یہاں کے لوگوں کو بھی شکایت کا موقع نہ ملے!"

میں نہ معزول ہونا چاہتی تھی، نہ اپنا قصہ ختم کرانا چاہتی تھی، میں نے اپنی ایک سہیلی حلیمہ سے مشورہ کیا، اس نے بھی قادن کی تائید کی، اس دن سے میں محتاط ہو گئی۔

---

(۳۹)

میں نجومی بن گئی

میرے عروج و اقتدار میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، والدہ سلطان کی خدمت میں ہر روز مجھے حاضر ہونا پڑتا، وہ مجھ سے اتنی مانوس ہو گئی تھیں کہ ان کی طلبی پر پہنچنے میں اگر ذرا بھی مجھے دیر ہوتی تو وہ پریشان ہو جاتیں، بظاہر وہ مجھے شطرنج کھیلنے کو بلاتی تھیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کھیلتی کم تھیں، باتیں زیادہ کرتی تھیں۔ ایک روز میں پہنچی تو کہنے لگیں۔

"نشاط جب تم آجاتی ہو تو مجھے بڑا سکون ملتا ہے، میرے افکار کم ہو جاتے ہیں، اور اب محسوس کرنے لگتی ہوں کہ جیسے کسی طرح کا ذہنی بوجھ مجھ پر نہیں ہے۔"

یہ باتیں سن کر میں احترام کے پورے آداب ملحوظ رکھتے ہوئے عرض پرداز ہوتی

"علیا حضرت نے جو کچھ فرمایا یہ ان کی ذرہ نوازی ہے، میری تو اگر جان بھی آپ کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے میں کام آجائے تو میں فخر سمجھوں گی۔"

میرے اس جواب سے ان کے چہرہ پر مسرت کی چمک نمایاں ہو جاتی اور کہتیں،

"مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے۔"

انہیں دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک روز میں بیٹھی اپنا ہاتھ دیکھ رہی تھی، والدۂ سلطان نے پوچھا۔

"کیا تمہیں ہاتھ دیکھنا آتا ہے؟"

یہ سن کر میں سٹ پٹا گئی، میں نے کہا۔

"کچھ یونہی سا —"

والدۂ سلطان کریں نے جو جواب دیا تھا وہ غلط نہ تھا، حرم سرا میں نہ ہوں گی تو پچاس نجومی عورتیں ضرور ہوں گی۔ ان کا کام یہی تھا کہ دن بھر محل سرا کا گشت کریں اور وہ ماندہ باندیوں کے ہاتھ دیکھ دیکھ کر انہیں خوش آئند اور خوش گوار مستقبل کے سبز باغ دکھائیں، ذرا دیر کے لئے سہی، اُن کی پیشین گوئیاں سن کر وہ بیچاری خوش ہوجایا کرتی تھیں۔ ان عورتوں سے مجھے بھی کئی بار سابقہ پڑا تھا اور میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ کس طرح ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر پیشین گوئیوں کا تانا بانا تیار کرتی ہیں میرا جواب سنکر والدۂ سلطان خوش ہوگئیں، انہوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا،

"ذرا دیکھو تو —"

میرے سامنے اس خاتون کا ہاتھ تھا جو اس محل سرا میں سب سے زیادہ باقتدار وبا اختیار ہستی تھیں۔ جس کے ایک اشارہ پر زندگی موت سے بدل جایا کرتی تھی، اس ہاتھ کو دیکھ کر میرا دل کانپنے لگا، میں سہم گئی، سوچنے لگی، کیا کہوں اور کیا نہ کہوں، بلکہ ایک طرح کی آسودگی، فخر بھی مجھے حاصل ہوئی۔ محل سرا کی سب سے بڑی ہستی میرے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ پر کان لگائے بیٹھی تھی۔

میں نے والدۂ سلطان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، یہ ہاتھ جڑاؤ ہاتھ تھا، انگلیاں سے لے کر کلائی تک ہیرے اور جواہرات چمکتے اور دمکتے نظر آرہے تھے، یہ دودھ

اندر ہی مطمئن نہ تھا۔ دولت جو اس کے ہاتھ پر نظر آ رہی تھی اگر غریبوں میں تقسیم کر دی جاتی تو کتنوں کا بھلا ہوتا؛ استنبول کے کتنے بھوکے آدمیوں کا پیٹ بھر جاتا۔

میں نے غور و توجہ سے ہاتھ کی ریکھائیں دیکھنا شروع کر دیں۔ کامل ایک منٹ تک خاموشی سے میں مطالعہ کرتی رہی اور اس عرصے میں میں سوچتی رہی کہ والدۂ سلطان مجھ سے کیا سننے کی توقع رکھتی ہیں اور مجھے کیا کہنا چاہیئے؛ میں یہی سوچ رہی تھی کہ انہوں نے پوچھا۔

"بتاؤ میری صحت کیسی رہے گی؟"

میں نے کہا۔

"بیماری کا تو کہیں دور دور نشان نظر نہیں آتا۔ میرا مطلب ہے کوئی خاص اور تکلیف دہ قسم کی بیماری ——————!"

والدۂ سلطان خوش ہو گئیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ پھیلائے بھکارن کی طرح ہوئے سوال کیا۔

"یہ تو بتاؤ میری ہر دلعزیزی اور مقبولیت کی کیا کیفیت رہے گی۔؟"

میں نے ہاتھ کی ریکھاؤں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج تک کسی ہاتھ میں ہر دلعزیزی کی اور مقبولیت کی اتنی گہری لکیریں میں نے نہیں دیکھیں۔"

والدۂ سلطان کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا وہ ذرا آگے بڑھیں اور سرگوشی کے لہجہ میں انہوں نے کہا۔

"میرا مستقبل؟ —————— اس کے بارے میں کیا کہتی ہو؟"

میں سوچنے لگی، اس بوڑھی خاتون کو اپنے مستقبل کا خیال بھی ہے —————— کیسا عجیب!

میں نے آہستہ سے کہا۔

"بے انتہا دوشمن، بے انتہا درخشاں!"

والدۂ سلطان میرے جوابات سے بہت مطمئن ہوئیں، انہوں نے فرمایا۔

"نشاط سلطانہ! قدرت نے تمہیں بہت بڑا ہنر دیا ہے۔ کاش تمہاری اس صلاحیت کا مجھے پہلے سے علم ہوتا؛ تو میری کتنی پریشانیاں رفع ہوجاتیں۔"

والدۂ سلطان کے ان الفاظ نے مجھ میں مسرت و انبساط کی ایک عجیب کیفیت طاری کر دی۔ اتنی بڑی ہستی کا اعتماد حاصل کر لینا کوئی معمولی بات تو نہ تھی لیکن میری یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ انہوں نے نہایت نازک اور ٹیڑھے قسم کے سوالات کی مجھ پر بوچھاڑ کر دی۔ انہوں نے پوچھا۔

"کیوں نشاط! اگر سلیم آغا کو پھانسی دے دوں تو کیسا رہے گا؟"

ابھی اس سوال کا میں جواب نہیں دے پائی تھی کہ والدۂ سلطان نے ایک اور سوال کیا۔

"بھلا رفعت پاشا کو میں ہلاک کرا دوں تو؟"

یہ اس سے زیادہ نازک سوال تھا۔ میں جواب سوچ رہی تھی کہ والدۂ سلطان نے ایک تیسرا سوال کر ڈالا۔

"عزت آغا کو اگر رہا کر دیا جائے تو کیسا رہے گا؟"

ذرا دیر خاموش رہ کر، والدۂ سلطان نے حکم دیا۔

"بالکل سچ سچ کہو!"

اب میرے لئے خاموش رہنا ممکن نہ تھا، یا جواب دیتی، یا اپنے اس حشر کے لئے تیار ہو جاتی جو سلیم آغا کے لئے مقدّر ہو چکا تھا۔ الفاظ میرے حلق میں اٹک رہے تھے، لیکن میں نے کہا۔

"پہلے سوال کا جواب ہے 'نہیں' "دوسرے سوال کا جواب ہے 'ہاں' "اور تیسرے سوال کے بارے میں میری رائے ہے کہ عزت آغا کو فوراً رہا کر دیجئے"۔

معلوم ہوتا ہے میرے جوابات والدۂ سلطان کے حسبِ منشاء تھے، وہ خاموش ہو گئیں، میں اپنے گوشے میں واپس آگئی، سخت پریشان تھی کہ کیا کر آئی ہوں؟ میرے ان جوابات کی روشنی میں اگر والدۂ سلطان نے کارروائی کی تو کیا اسکی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی، ایک آدمی جسے میں بالکل نہیں جانتی، نہ جس کے محاسن میرے علم میں ہیں نہ معائب، مجھے کیا حق تھا کہ میں اس کے ہلاک کر دیئے جانے کی تائید کرتی، انسانی ہمدردی کا تقاضا تو یہ تھا کہ اپنی جان خطرہ میں ڈال کر اگر ہو سکے تو دوسرے کی جان بچا لی جائے مجھے کوئی خطرہ نہ تھا، لیکن میں نے ایک آدمی کو موت کی گود میں ڈھکیل دیا تھا، یا اللہ! تو دلوں کو دیکھنے والا ہے، میرے اوپر رحم فرما! مجھ سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے، اسے معاف کر دے، میں تیری پناہ چاہتی ہوں، لیکن اس دعا کے بعد بھی دل کو تشفی نہ ہوئی، بڑی دیر تک بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔

میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ مجھے کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہئے کہ جو دوسروں کی زندگی پر اثر انداز ہو۔ اس کے بعد میں نے اپنا معمول بنا لیا کہ گو والدۂ سلطان میری صلاح و مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرتی، لیکن اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے میں نے گول مول جواب دینے شروع کر دیئے، اسی میں عافیت تھی، اسی طرح اپنے آپ کو محفوظ رکھ کر دوسروں کی جان بچا سکتی تھی، مجھے یاد نہیں، اس کے بعد میں نے کبھی کسی کی ہلاکت کا مشورہ دیا ہو۔

(۴۰)

قتل کے بعد خیرات

جہاں والدۂ سلطان کی نگاہ میں میری عزت و وقعت بڑھ رہی تھی - وہاں حرم سرا کی دوسری لڑکیوں اور عورتوں کی نگاہ میں مَیں معتوب اور مشتبہ قرار دی جا چکی تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو میرے اس عروج و ترقی پر مجھ سے جلنے نہ لگا ہو، خواجہ سرا تک مجھ سے خار کھانے لگے تھے، اس لئے کہ میرا اقتدار ان کے اقتدار سے بھی ٹکراتا رہتا تھا، بظاہر اس ترقی پر میں بہت خوش تھی، میرے پاس محل سرا کی خواتین تحائف بھیجتیں، گھنٹوں اور پہروں مجھ سے خوشامدانہ باتیں کرتیں، والدۂ سلطان سے ان کا جو کام اٹک جاتا، اس کے لئے میری سفارش کی جویاں ہوتیں، اُن کے نزدیک اس جنت ارضی کی کنجی میرے ہاتھ میں تھی، ہر ایک کو سب کچھ میں دے سکتی تھی اور جہاں تک مجھ سے ہو سکتا، میرا اصول یہ تھا کہ کسی کی آس توڑنی بھی نہیں تھی۔

والدۂ سلطان کا اب یہ عالم تھا کہ میرے بغیر انہیں قرار نہ آتا۔ رات کو سوتے سوتے آنکھ کھل جاتی تو بھی مجھے بلا لیتیں۔ میں کتنی ہی منہ چڑھی بن جاتی لیکن حرم سرا کے آداب کو بالائے طاق رکھنا تو میرے لئے کسی طرح بھی ممکن نہ تھا جب بھی میری طلبی ہوتی تو مجھے تمام قاعدوں اور ضابطوں کے ماتحت لباس تبدیل کرکے اور

آراستہ پیراستہ ہو کر ان کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا۔ اس تیاری میں کم سے کم پون گھنٹہ ضرور لگ جاتا، پھر میں اس کمرہ میں پہنچتی جو باریابی کے لئے مخصوص تھا، وہاں سے والدۂ سلطان کی خواب گاہ میں پہنچائی جاتی جہاں وہ اضطراب کے عالم میں میرا انتظار کر رہی ہوتیں۔

ایک روز اسی طرح انہوں نے مجھے طلب فرمایا اور میں کوئی پون گھنٹے میں پہنچی۔ بڑی بے کلی کے ساتھ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"بڑی دیر لگا دی تم نے نشاط سلطانہ! کتنی دیر سے راہ تک رہی ہوں، اب آئی ہو"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اور ادب سے سر جھکا کر عرض کیا،

"علیا حضرت بجا فرماتی ہیں، لیکن آپ کی خدمت گرامی میں حاضر ہونے سے پہلے مجھے تیار بھی تو ہونا پڑتا ہے"

والدۂ سلطان نے فرمایا۔

"ان رسمیات و تکلفات کی پابندیوں سے تمہیں آزاد کرتی ہوں، میرا پیغام سن کر جیسی بیٹھی ہو، اسی طرح چلی آؤ۔"

میں نے اسی طرح سینے پر ہاتھ رکھے رکھے اور سر جھکا کر عرض کیا۔

"آئندہ ایسا ہی ہوگا، علیا حضرت"

میرے اس جواب سے والدۂ سلطان مطمئن ہوگئیں، انہوں نے فرمایا،

"ٹھیک ہے ——— اچھا یہ تو بتاؤ، عثمان آغا کو پھانسی دیدوں یا قید کر دوں؟"

اس سوال نے عجیب مصیبت کھڑی کر دی میرے لئے، مجھے بھلا عثمان آغا اور اس کے نامعلوم جرائم سے کیا تعلق؛ بہر حال میں نے درمیانی راستہ اختیار کر لیا اور کہا،

"پھانسی نہ دیجئے، قید کر دیجئے ——— "

معلوم ہوتا ہے، میرے اس جواب سے والدۂ سلطان کی تشفی نہ ہوئی۔ انہوں نے فرمایا،

"کیا واقعی تمہاری رائے یہی ہے؟ ——— میں تو اس کم بخت سے عاجز آگئی ہوں۔ نفرت کرتی ہوں اس سے۔ میرا کلیجہ اس دن ٹھنڈا ہوگا جب اس کی کٹی ہوئی گردن دیکھوں گی۔ اس نے مجھے بہت دکھ پہنچایا"

بہرحال میں اپنی رائے پر اڑی رہی یا دل ناخواستہ انہوں نے اس کی جان لینے سے احتراز کیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ خفگی کی وجہ یہ تھی کہ آغا نے ظل اللہ سے ایک سپاہی کے لئے رحم کی درخواست کی تھی۔ جو ایک معمولی سی خطا پر معتوب قرار پایا تھا اور جس کے معتوب ہونے کا سبب والدۂ سلطان تھیں۔

جب کبھی بھی والدۂ سلطان مجھے اپنے حضور میں طلب کرتیں، ان لوگوں کے بارے میں جنہیں سلطان معظم کی بارگاہ سے پھانسی یا قتل کی سزا دی جاتی ضروری تفصیلات بتانے کے بعد ایک بڑی رقم میرے حوالے کرتیں کہ اس سے ٹوٹی پھوٹی مسجدوں کی مرمت کرا دی جائے، اور پھر نہایت سادگی سے گویا ہوتیں۔

"خدائے بزرگ و برتر ان لوگوں پر بہت مہربان ہوتا ہے جو خیرات کرتے ہیں!"

والدۂ سلطان کی یہ باتیں سنکر میں دنگ رہ جاتی اور دل میں سوچنے لگتی، کہ مسجدیں خواہ کتنی ہی ٹوٹی پھوٹی ہوں، کیا ان کی مرمت سے وہ گناہ کم ہوجائے گا، جو بے گناہوں کے قتل کا نتیجہ ہے؟ اللہ تعالیٰ اپنی کسی مخلوق کا بھی خون ناحق گوارا نہیں کرسکتا۔ جب کبھی بھی والدۂ سلطان اس سلسلہ میں مجھے کوئی رقم عنایت کرتیں تو بصورت میں ان کے ضمیر کی خلش محسوس کرلیتی۔ بلکہ جرم کی وسعت کا بھی پورا پورا اندازہ مجھے ہوجاتا۔ جہاں تک ظاہرداری کا تعلق تھا یا اوراد و وظائف، تسبیح و تہلیل اور تلاوت

قرآن کا تعلق تھا۔ والدہ سلطان بڑی مذہبی خاتون تھیں، قرآن کی آیتیں اُن کے نوک زبان رہتی تھیں، وہ اکثر وہ آیت پڑھا کرتی تھیں جس کا مطلب یہ ہے۔

"وہ دن یاد رکھو، جب تمہیں خدا کے حضور میں پیش ہونا اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا پڑے گی"

یہ آیت سن کر میں سوچنے لگتی، کیا والدہ سلطان بھی کسی دن خدا کے حضور میں پیش ہوں گی اور اپنے اعمال کی جواب دہی کریں گی؟

جب بہت زیادہ والدہ سلطان پر مذہبی کیفیت طاری ہوتی تو وہ فرماتیں،

"میں اللہ کی گنہگار بندی"

کبھی کبھی یہ بھی ارشاد ہوتا۔

"ہماری قسمت ہماری پیشانی پر مرقوم ہے۔"

میرے لئے یہ اندازہ کرنا بہت مشکل تھا کہ خدا پر اتنا محکم اعتقاد اور قسمت پر اتنا اٹل عقیدہ رکھنے کے باوجود آخر انہوں نے اپنے آپ کو نجومیوں کے رحم و کرم پر کیوں ڈال دیا تھا؟ شاید میرے یہ تاثرات ایک مرتبہ میرے چہرہ پر انہوں نے پڑھ لئے، ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا۔

"میرا عقیدہ ہے کہ خدا نے تمہیں میرے پاس میری دستگیری کے لئے بھیجا ہے۔"

اُن کے الفاظ کا زور یہ ثابت کر رہا تھا کہ واقعی ان کا خیال یہی ہے۔

والدہ سلطان کے پاس سے اٹھ کر جب میں اپنے کوشک میں واپس آتی تو میری باندیاں میرے بارے میں تازہ خبروں کا پشتارہ لے کر آن موجود ہوتیں، وہ مجھے بتاتیں کہ حرم سرا کی رہنے والیاں میرے اقبال و عروج سے کس درجہ ہراساں اور فکر مند ہیں اور میرے بارے میں کس درجہ تشویش کا اظہار کیا کرتی ہیں، ایک

باندی نے مجھے بتایا "آپ کے خلاف سازشیں جڑ پکڑتی جا رہی ہیں ـــــ"

میں نے پوچھا۔

"کیوں؟ کس لئے؟ ـــــــ"

آپ کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ والدہ سلطان کی چہیتی کیوں بنتی جا رہی ہیں۔"

میں نے اس سے کہا۔

"ان لوگوں کو والدہ سلطان سے جلنا چاہیئے نہ کہ مجھ سے"

وہ ہنسنے لگی، اس نے کہا۔

"ان کا خیال ہے کہ آپ نے والدہ سلطان پر جادو کر دیا ہے۔

مجھے بھی ہنسی آگئی، میں نے کہا۔

"میں نے جادو کر دیا؟ ـــــــ اگر مجھے جادو آتا ہوتا تو والدہ سلطان کے بجائے سلطان معظم پر جادو نہ کرتی؟"

وہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔

"ہاں آپ کہتی تو ٹھیک ہیں لیکن ان کا خیال یہی ہے ـــــــ ان لوگوں کے سوالات نے تو میرا ناطقہ تنگ کر دیا ہے۔"

مجھے حیرت ہوئی، میں نے باندی سے پوچھا۔

"میرے بارے میں تم سے بھی سوالات کئے جاتے ہیں؟"

اس نے بتایا

"جی ہاں بہت سے!"

میں نے پوچھا

"مثلاً کس قسم کے سوالات؟"

وہ کہنے لگی

"مثلاً یہ ـــــــــ!"

کس طرح کے کپڑے آپ پہنتی ہیں، کون سے جواہرات آپ استعمال کرتی ہیں، کن خوشبویات سے آپ کو شوق ہے، والدۂ سلطان کب اور کس وقت آپ کو طلب کرتی ہیں۔"

باندی کی یہ باتیں سنکر میرے اندر ایک طرح کا احساس برتری پیدا ہُوا۔ آخر وہ میرا بڑھتا ہُوا اقتدار ہی تو ہے جس نے محل حرم سرا کی رہنے والیوں کو میرا حاسد بنا دیا ہے!"

---

(۴۱)

منزل قریب آگئی

حرم سرا میں صبح ہوتے ہی قسمت کا حال بتانے والی نجومی عورتیں گشت کرنے لگتیں، قبل اس کے کہ ہم بستر سے اُٹھ سکیں یہ موجود، ہماری ہر بات اور ہر چیز ان کے ہاتھ میں تھی، صبح کس وقت ہمیں اُٹھنا چاہیئے، کس وقت غسل کے لئے حمام میں جانا چاہیئے؛ ——————

کس وقت ہمیں مالش کرانا چاہیئے؛ آج کے دن کون سے جواہرات ہمارے لئے قسمت ور ہوں گے؛ کون سی غذا آج استعمال میں لانی چاہئے؛ کس رنگ کے کپڑے آج موزوں رہیں گے؛ —— یہ سب باتیں اپنی قسمت کا حال بتانے والیوں کی جنبش لب پر منحصر تھیں،

لولا — اپنے آپ کو ہر دن کی پیش آنے والی اچھی اور بری چیزوں کا پیامبر سمجھتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ یہ عورت میرے لئے تو واقعی جادوگرنی تھی، میں نے کبھی اس کی پیشین گوئی غلط نہیں پائی، اکثر ایسا ہوتا کہ اس کی عجیب غریب اور بظاہر ان ہونی پیش گوئیوں پر میں ہنس دیتی، قہقہے لگاتی، لیکن یہ دیکھ کر

حیران رہ جاتی کہ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بہ حرف پیش آیا،

ایک روز صبح صبح لولا نے جب میری باندیاں اپنے اپنے کام سے جا چکی تھیں، مجھ سے کہا،

"گذشتہ شب میں نے دیکھا کہ والدۂ سلطان تم پر بہت مہربان ہیں، پھر میں نے دیکھا ایک آگ ہے جو تمہارے چاروں طرف بھڑک رہی ہے ۔۔۔!"

پھر لولا نے اپنی آواز مدھم کر دی اور رازدارانہ طور پر بولی،

"میں نے تمہیں ایسی ہستی کی بارگاہ میں مرتبۂ خاص پر فائز ہوتے دیکھا، جسے ہم سب پر ہر طرح کے اختیارات حاصل ہیں، جسے چاہے بخش دے، جس کی چاہے جان لے لے، وہ ساری دنیا کا تاجدار ہے ـــــــ سلطانِ معظم!

لولا کی آنکھیں چمک رہی تھیں، وہ اپنے ہاتھ فضا میں لہرا رہی تھی۔ میں ایسا محسوس کر رہی تھی اس کا جسم میرے پاس ہے، روح کہیں اور ہے، میرا سارا بدن سرد پڑ گیا، مجھ پر دہشت کی کیفیت طاری ہو گئی،

لولا نے اس حالت میں اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا

میں دیکھ رہی ہوں کہ حرم سرا میں سب سے زیادہ با اقتدار و با اختیار ہستی تمہاری ہے، سب سے زیادہ دولت مند، سب سے زیادہ سفاک، تمہارا وجود، نہ جانے کتنوں کے لئے پیامِ ہلاکت بنا ہوا ہے ـــــــ خود اپنے وجود کے لیے بھی تم کچھ کم خطرہ نہیں ہو!"

یہ کہہ کر اس نے لمبی لمبی سانس لی، اور ذرا دیر کے بعد اپنی حالت پر واپس آ گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مر کر زندہ ہوئی ہے۔ زرد رو نحیف و کمزور چہرے پر کہیں خون کا ایک قطرہ نظر نہیں آتا تھا،

....

میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا،

"تو کیا تم عجیب باتیں کر رہی ہو۔"

وہ بے خودی کے عالم میں بولی،

"میری بیٹی، میں کیا کہتی ہوں، یہ خود مجھے نہیں معلوم!"

میں نے سوال کیا،

"تو جو کچھ تم کہتی ہو کیا وہ درست اور صحیح نہیں ہے؟"

وہ گویا ہوئی،

"یہ کیسے نہیں ہے؟ ——— جو کچھ میں کہتی ہوں، وہ خود سے نہیں کہتی کہلوایا جاتا ہے مجھ سے، جو کچھ میرے منہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ میں اگل دیتی ہوں میرے منہ سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ دوسروں کے ہوتے ہیں، اُن کے جو اس دُنیا کی مخلوق نہیں ہیں، میں تو صرف ایک آلہ ہوں، ایک ذریعہ جس سے کام لے کر وہ اپنی بات کہلوا دیتے ہیں، میں تم سے وہی بات کہتی ہوں جس کے بارے میں وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اس کا علم ہو جائے۔"

میں سراپا حیرت بنی اُسے دیکھ رہی تھی، میں نے پوچھا،

"کیا تم اپنی کہی ہوئی باتوں کے بارے میں میرے سوالات کا جواب دے سکو گی؟"

وہ آمادگی اور مستعدی سے کہنے لگی،

"کیوں نہیں ——— لیکن پہلے ان سے رابطہ قائم کر لینے دو مجھے ——— ان سے جو اس دُنیا کی مخلوق نہیں ہیں!"

میں نے سوال کیا۔

"تو پھر تم میرے سوالات کا جواب کب دو گی؟ کل دریافت کروں

کسی نیت ؟

وہ کہنے لگی ،

"ہاں ———— اس پیام رسانی سے میں بہت تھک جاتی ہوں ذرا آرام بھی تو چاہیے میرے کمزور بدن کو !"

وہ چلی گئی !

لولا نے آج جو باتیں مجھ سے کی تھیں انہوں نے میرے تلاطم جذبات پر عجیب ناقابلِ بیان کیفیت طاری کر دی !

والدہ سلطان کے حضور میں میری خصوصیت کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا تھا ، وہ گو ٹھیک تھا لیکن زیادہ اہم نہیں تھا۔

لیکن اس نے کچھ اور بھی تو کہا تھا !

باتیں تھیں جنہیں میں اپنی دلی آرزوؤں سے تعبیر کر سکتی ہوں ، لیکن آج تک انہیں زبان پر نہ لائی تھی ، حد یہ ہے کہ تنہائی میں اپنے آپ تک سے یہ باتیں کرنے کی میں جرأت نہ کر سکی تھی ———— ان باتوں نے میرے اندر عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی ، میں اس پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی ، جو پنجرے میں بند ہو اور راہِ فرار نہ پا کر تڑپ رہا ہو۔

لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی !

مجھ میں ایک عجیب طرح کی مسرت اور انبساط کی امنگ پیدا ہوئی ، بے ساختہ میرے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا ،

میں آپ ہی آپ باتیں کرنے لگی .

لولا ، کس قسم کی عورت ہے ، کیا واقعی اس کا کسی اور طرح کی مخلوق سے رابطہ ہے۔

- نہیں یہ نہیں ہو سکتا، یہ غلط ہے، دھوکا ہے، فریب ہے،
اپنے نورانی پیکر کے بارے میں اس کی باتیں کتنی مضحکہ خیز ہیں؛
میں بے ساختہ ہنسنے لگی،
لیکن اس خندۂ استہزا میں بھی میرے دل کے اندر سے آواز اٹھ رہی تھی، کاش لالانے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ثابت ہو؛
مجھے دولت، اقتدار اور اختیار کا شوق ہے —— اور یہ سب چیزیں صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہیں کہ میں محبوبۂ سلطان بن جاؤں!
پھر یکایک میرے ذہن میں سلطان معظم کی موجودہ محبوبہ کی تصویر گردش کرنے لگی۔
سلطان معظم اسے کتنا زیادہ چاہتے ہیں، اس کا دبدبہ اور طنطنہ والدۂ سلطان سے بھی زیادہ ہے، اس کی خوبصورتی اور سحر طرازی کا چرچا کہاں نہیں ہوتا، ہر شخص جانتا ہے، سلطان معظم، ساری دنیا کے فرماں روا ہیں اور وہ خود سلطان پر حکومت کرتی ہے، اور یہ تھی کیا؛ —— ایک رقاصہ،
اور میں؛ —— کیا میں، ایک بہت بڑے سردار قبیلہ کی لڑکی اور پوتی نہیں ہوں؛
کیا میں بدصورت ہوں؛
بھدی اور بدنما ہوں؛
ان سوالات کا جواب مجھے معلوم ہے —— میں جانتی ہوں سلطان کی محبوبہ جتنی، بھی خوبصورت اور سحر طراز ہو، مگر میرا مقابلہ نہیں کر سکتی،
مجھے معلوم ہے سلطان پر اس کی دسترس رہین منت ہے اس کے ناز و غمزہ کی،
تو کیا یہ ناز و غمزہ، عشوہ و ادا میں اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتی؛

میرا یہ حسن، میرا یہ جمال، میری یہ آب و تاب، اور پھر میرا ناز و غمزہ عشوہ و ادا بھلا کوئی ٹھہر سکے گا میرے مقابلہ میں ؟

نہیں ——————— ہر قیمت پر میں خود اپنی تربیت کروں گی، اور دکھا دوں گی کہ سلطان کی محبوبہ میں بن سکتی ہوں، میں اس اعزاز کی مستحق ہوں، یہ منصب حاصل کر کے رہوں گی،

لولا نے جو کچھ کہا ہے، وہ بہرحال صحیح ثابت ہو گا!

میں نے اب لولا کو اپنے پاس مستقل طور پر رکھ لیا!

یہ عروج و اقتدار اور قوت و طاقت کی طرف میرا پہلا قدم تھا!

لولا مجھے بتاتی رہے گی کہ میرے گرد کس طرح کے خطرات منڈلا رہے ہیں، کون کون میرا دشمن ہے، میری تباہی اور بربادی کے کیسے کیسے منصوبے تیار کئے جا رہے ہیں؟ ان سب باتوں سے بروقت واقف ہو کر ان کا بروقت توڑ میرے اختیار میں ہو گا، اور آخر وہ دن آ جائے گا، جب سلطان معظم میری مٹھی میں ہوں گے، دولت میرے قدموں پر ہو گی، اقتدار، اختیار کی کنجی میرے ہاتھ میں ہو گی،

یہ ایک داؤں تھا، میں یہ کھیل کھیلنے کا تہیہ کر چکی تھی، میرے کان میں لولا کے الفاظ گونج رہے تھے، کل ہی رات کو تو اس نے کہا تھا،

"اللہ کارساز ہے، وہ سب سے بڑا اور سب پر حاکم ہے، وہ تمہیں ہر گزند سے محفوظ رکھے گا!"

عزیزی جب سے مری تھی، حرم سرا میں میرا کوئی ہمدرد اور غمگسار نہیں تھا، ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتا تھا، بظاہر ہم ایک دوسرے سے اخلاق و تپاک کے ساتھ پیش آتے تھے، لیکن دل ہی دل میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، ایک اندرونی اور ذہنی کشمکش ایک دوسرے کو زک پہنچانے

کی برابر ہمارے مابین جاری رہتی تھی، ہم میں سے ہر کوئی اپنی ہوشیاری، فراست مکر، فریب، انداز، ادا، جمال، خوب روئی، لباس فاخرہ، گراں بہا زیورات اور اقتدار و اختیار کے لئے وقف کئے ہوئے تھا، ہر ایک کی خواہش تھی کہ دوسرے کو نیچا دکھائے، اور خود سب کچھ حاصل کر لے،

ہر روز، جب لولاچلی جاتی، میں اپنے آپ کو اور زیادہ سنوارنے اور دوسروں سے برتر بنانے میں مصروف ہو جاتی، خوش قسمتی سے مناسبات کا منصب میرے پاس تھا، اس وجہ سے بہت سے لوگوں کو حرم سرا میں مجھ سے اور مجھے بہتوں سے ملنا پڑتا، سب ملنے والوں پر اپنے اخلاق اور شخصیت کا زیادہ سے زیادہ اثر ڈالنے کی میں کوشش کرتی تھی اور یقیناً کامیاب بھی ہوتی تھی،

میری سب سے پہلی کوشش یہ تھی کہ جو ذمہ داریاں مجھے تفویض کی گئی ہیں انہیں خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دوں، کسی طرح کی خامی میرے کام کے اندر نہ رہنے پائے، میں نے اپنی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا کہ چند ہی روز کے بعد مجھے اپنی خاص باندیوں سے ایک نئی بات معلوم ہوئی،

مجھے معلوم ہوا کہ ایک سابق محبوبۂ سلطان میری باندیوں سے مختلف طریقوں سے کام لے کر یہ دریافت کرتی رہتی ہیں کہ آیا موجودہ محبوبۂ سلطان سے زیادہ خوبصورت اور سحر طراز ہوں،؛

انہی باندیوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حرم سرا میں جو عورتیں محبوبۂ سلطان بننے کی آرزومند ہیں، انہیں صرف ایک ہی فکر ہے، یہ کہ میں کسی طرح راستہ سے ہٹ جاؤں، اپنا دل ٹھنڈا کرنے کے لئے وہ مضحکہ خیز حرکتوں پر اتر آئی تھیں، ایک صاحبہ نے آٹا گوندھا، اور میرا پتلا بنایا، پھر اسے آگ میں ڈال کر بھسم کر دیا، گویا میرا وجود خاکستر کر دیا اور اس طرح یقین کر لیا کہ وہ دن جلد

آنے والا ہے، جب اس طرح میں برباد ہو جاؤں گی،
ایک اور صاحبہ تھیں جو مجھے "گائے" سے تشبیہ دیا کرتی تھیں،
ایک اور صاحبہ فرمایا کرتی تھیں کہ بڑی بدنما عورت ہے۔
یہ باتیں سنکر دل برداشتہ ہونے کے بجائے میں خوش ہوتی،
کیونکہ یہ الفاظ اس حقیقت کی غمازی کر رہے تھے کہ یہ عورتیں مجھ سے خار کھاتی ہیں، جلتی ہیں مجھ سے اور ظاہر ہے کوئی شخص اس سے جلتا اور خار کھاتا ہے جسے اپنے لئے خطرہ سمجھتا ہو، میں اگر بے حقیقت ہوتی تو انہیں مجھ پر ترس آتا، یا مجھے نظر انداز کر دیتیں، لیکن میرے ایسے ایسے نام رکھ کر دل کے جلے پھپھولے پھوڑنا اس بات کا ثبوت تھا کہ انہیں مجھ سے کد ہے، یہ میرے متوقع اقتدار سے خائف ہیں ——— میں نے محسوس کر لیا میں ٹھیک راستہ پر جا رہی ہوں، میری منزل مجھ سے قریب آ رہی ہے۔

---

(۴۲)

زہر

لولا۔ اب میرے لئے اتنی ہی ناگزیر بن گئی تھی جتنی کسی آدمی کے لئے غذا" وہ مستقبل کا حال بتا دیتی تھی، اور وہ صحیح بھی ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں وہ کچھ دیکھ لیتی تھیں جو دوسروں کو نظر نہیں آتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھ سے کہا۔

آج تمہارے کھانے میں زہر ملا دیا جائے گا۔ خبردار نہ کھانا۔

یہ سن کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے پوچھا۔

کس وقت کے کھانے میں زہر ملایا جائے گا۔

تھوڑے تامل کے بعد لولا نے بتایا۔

دوپہر کے کھانے میں۔

یہ ایک نیا دھچکا تھا۔

اس کے معنی یہ تھے کہ میری خاص باندیوں میں بھی کوئی باندی دشمنوں سے ملی ہوئی تھی۔ خوف اور دہشت نے میرے چہرے کا رنگ متغیر کر دیا۔ بڑی دیر تک میں غور کرتی رہی یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔ کسی کے بارے میں بھی دل یقین کرنے پر آمادہ نہ ہوا کہ دشمن

کے بہانے میں آ کر وہ میری جان کی لاگو ہو سکتی ہے۔ میں نے لولا سے پوچھا

تمہیں خدا کا واسطہ دیتی ہوں، مجھے اس کا نام بتاؤ، میرے کھانے میں زہر ملانے والا کون ہے؟

یہ سنتے ہی لولا دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی، ایسا معلوم ہوا جیسے اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد اس نے آنکھ کھولی اور اس نے کہا۔

"زینب ــــ !"

"زینب ــــــــــــــ ؟"

میں نے یہ لفظ اس طرح دہرایا جیسے کوئی خواب میں بات کر رہا ہو۔ میری باندیوں میں سب سے زیادہ بھروسہ کی عورت یہی تھی۔ اس سے بڑھ کر اپنا وفادار اور جاں نثار میں کسی کو نہیں سمجھتی تھی، ــــــــ نہیں میں ہرگز باور نہیں کر سکتی کہ زینب ایسی حرکت کر سکتی ہے۔

لولا نے کہا

اُسے رشوت دی گئی ہے۔ فریدہ نے اُسے رشوت دی ہے، جو تم سے نفرت کرتی ہے۔ جو تمہاری دشمن ہے۔

یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی، مجھ سے پہلے والدہ سلطان اس کا بڑا لحاظ کرتی تھیں، لیکن جیسے جیسے میں اُن کی نگاہ میں چڑھتی گئی یہ اترتی گئی۔ لیکن اس نے میری خاص الخاص باندی کو کس طرح پرچا لیا۔

تھوڑی دیر لولا خاموش بیٹھی رہی اس کے بعد چلی گئی۔

میں سوچنے لگی اب مجھے کیا کرنا چاہئیے، آج اگر میں دوپہر کا کھانا نہ کھاؤں تو زہر سے بچ جاؤں گی، لیکن زہر کے علاوہ بھی کئی طریقے جان لینے کے ہو سکتے ہیں۔ اب زیدہ ان پر بھی عمل کرے گی۔ آخر میں کب تک چوکنی رہوں گی، ذرا بھی غافل ہوئی اور اس نے

بھرپور وار کیا۔

بڑی دیر تک میں انہیں خیالات میں الجھی بیٹھی رہی، پھر اپنے کام سے فارغ ہو کر میں ڈائننگ روم کی طرف روانہ ہوئی۔ چونکہ اب کھانے کا وقت آ چکا تھا۔

میں جا کر دسترخوان پر آ گئی، میری باندیاں میرے گرد آ کر جمع ہو گئیں ان میں زینب بھی تھی، اس کا بھولا چہرہ اور بڑی بڑی صاف شفاف آنکھیں دیکھ کر میرا یہ گمان کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ اسے مجرم سمجھوں۔ لیکن میں اس پر تُلی ہوئی تھی کہ معاملہ صاف ہو جانا چاہئیے۔

میں نے حکم دیا۔

سارا کھانا لا کر میرے سامنے رکھ دیا جائے۔

ایک لفظ بھی کہے بغیر باندیوں نے چاندی کی پلیٹوں میں پلاؤ۔ مرغ کا بھنا ہُوا گوشت، قورما اور دوسری چیزیں لا کر رکھ دیں۔ کھانے سے اتنی مزیدار مہک آ رہی تھی کہ مجھے یہ سوچ کر بیساختہ ہنسی آ گئی کہ یہ کھانا زہرآلود ہو سکتا ہے، پھر میں نے یہ بھی سوچا بھلا زینب مطبخ میں کس طرح جا سکتی ہے، اور چلی بھی جائے تو زہر کس طرح ملا سکتی ہے۔ لیکن لولا کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے، میرا دل ایک انجانے خوف سے دبا ہوا تھا۔

میں نے ایک باندی سے کہا۔

زینب سے کہو اپنے برتن لے آئے۔

یہ سنتے ہی باندی نے میرا حکم زینب تک پہنچا دیا۔ میں آنکھیں جھکائے مسہری کو تک رہی تھی۔

میں نے زینب کے باہر جانے اور پھر اندر واپس آنے کی آواز سنی، جب وہ آ گئی تو میں نے ایک باندی سے کہا۔

جو کھانا میرے سامنے رکھا گیا ہے یہ زینب کو دے دو۔

یہ کہہ کر میں نے زینب کی طرف دیکھا اس کا چہرہ اعتراف جرم کر رہا تھا، وہ بھاگی اور میرے قدموں پر گر پڑی، میرے دوپٹہ کا دامن اس نے اٹھایا آنکھوں سے لگایا، پھر اسے بوسہ دیا اور کہا۔

رحم رحم

میں نے محسوس کر لیا لولانے زینب کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ صحیح تھا، میں نے زینب کی التجائے رحم کے جواب میں کہا۔

جو باندی اپنی مالکہ کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کرے اس کے منہ سے رحم کی التجا بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔

وہ اسی طرح میرے قدموں پر پڑے پڑے کہنے لگی۔

آپ کو سب کچھ معلوم ہے میری سلطانہ مجھے معاف کر دیجیے۔

میں نے بے رخی کے ساتھ کہا۔

ہاں زینب میں سب کچھ جانتی ہوں ـــــ تم وہی ہو نا جس پر مجھے سب سے زیادہ بھروسہ تھا۔

یہ سن کر زینب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، میں نے کہا

تم بلخ میں کس طرح پہنچیں؟

وہ اتنی دہشت زدہ ہو رہی تھی، کہ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی، میں نے فیصلہ کیا کہ وقت آگیا ہے کہ مجرم کو سزا دی جائے اور وہ سزا ایسی ہو جو دوسروں کی آنکھیں کھول دے جس سے دوسروں کو عبرت ہو اور پھر کوئی ایسی جرأت نہ کر سکے میں نے کہا نمک حرام لڑکی یہ کھانا تجھے کھانا پڑے گا۔ یہ کھانا تو کھائے گی اور مرے گی۔

میں نے حکم دیا کہ پولیس کا افسر اعلیٰ طلب کیا جائے۔ زینب فرش پر لوٹ رہی

تھی۔ اور رو رہی تھی، فریاد کر رہی تھی اور معافی مانگ رہی تھی۔ دوسری باندیاں پاس کھڑی حیرت اور عبرت کی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں، گم سم جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ان سب پر اپنا حکم چلایا کرتی تھی، اور آج موت کے دروازے کی طرف دھکیلی جا رہی تھی۔

پولیس کا افسرِ اعلیٰ فوراً حاضر ہوا۔ میں نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیا اور کہا اس لڑکی کو محبس میں لے جاؤ اور قید تنہائی میں رکھو۔ اس بات کا لحاظ رکھو یہ کھانا جو اس کے لئے جا رہا ہے اس کے علاوہ اسے کچھ نہ مل سکے۔ وقتاً فوقتاً مجھے اس کے بارے میں رپورٹ دیتے رہو۔

زینب فرش پر ایک بے جان لاش کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ افسرِ اعلیٰ نے دو سپاہیوں کو بلایا اور اسے اٹھا کر لے گیا۔ جو دوسرے لوگ موجود تھے انہیں بھی رخصت کر دیا۔ اور بغیر کھانا کھائے اپنے کمرہ میں واپس آگئی۔ میں یہ دیکھ کر مطمئن ہوئی کہ دوسری باندیوں پر میرے اس طرزِ عمل کا بڑا اثر ہوا۔ یہ اتنی زیادہ چوکس اور چوکنا ہوگئیں کہ حیرت ہوتی تھی کہ اتنی فرض شناسی اور پھرتی ان میں کہاں سے آگئی۔ اگر ان میں سے کسی کو میں کسی کام سے بلاتی تو وہ اس طرح لرزاں و ترساں میرے سامنے آتی جس طرح قصاب کے سامنے گائے۔

کئی دن کے بعد پولیس کا افسرِ اعلیٰ میری خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے پوچھا

کہو ہمارے قیدی کا کیا حال ہے؟

افسرِ اعلیٰ نے جواب دیا

اس لڑکی نے اب تک ایک لقمہ بھی نہیں کھایا ہے۔

میں نے حکم دیا

جو کھانا اس کے ساتھ گیا ہے اس کے سوا ہرگز اسے کھانے کو نہ دیا جائے۔

افسرِ اعلیٰ نے جھک کر مجھے سلام کیا اور چلا گیا۔

دو روز کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ وہ میری خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ میں نے اسے بلایا۔ وہ خاموشی اور سنجیدگی کا پیکر بنا ہوا حاضر ہوا۔ اس نے کہا۔

"آج اس لڑکی نے آپ کا بھیجا ہوا کھانا کھایا، جس طرح کوئی بھوکا کتا ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس طرح کئی دن کے فاقے کے بعد وہ کھانے پر ٹوٹ پڑی اور تھوڑی دیر ہوئی کافی تکلیف اٹھانے کے بعد وہ مر گئی۔"

میں نے ہاتھ کے اشارہ سے افسر اعلیٰ کو رخصت کر دیا۔ اور جب وہ چلا گیا تو میں نے اپنی باندیوں کو بھی جو یہ خبر سن کر ہوش و حواس کھو چکی تھیں رخصت کر دیا۔ بیساختہ مجھے ایک مثل یاد آگئی۔

"جب آرزوؤں کا پرندہ اپنے پر پھیلاتا ہے، عزت اور کامیابی اس کا نشیمن بن جاتی ہے۔"

میری آرزوؤں اور تمناؤں کا پرندہ اپنے پر پھیلا چکا تھا۔ میرے اور کامیابی کے راستہ میں اب کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی تھی، میرا فیصلہ اٹل تھا، میری منزل متعین تھی، اس جگہ میں یہ اعتراف بھی کرنا چاہتی ہوں کہ زینب کئی دفعہ مجھے یاد آئی، فرش پر اس کا لوٹنا اور رونا مجھے جب یاد آتا تو ایک خلش سی محسوس ہوتی، لیکن فوراً ہی مجھے اس کا ناقابل معافی جرم بھی یاد آجاتا۔ اور میں حقارت کے ساتھ اس کا خیال جھٹک دیتی۔

ایک خیال اور بھی میرے دل میں آتا تھا۔ زینب فریدہ کی آلۂ کار تھی، وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچی لیکن فریدہ بدستور موجود ہے۔ کیا فریدہ کسی اور کا دامن سیم وزر سے بھر کر اسے میری جان لینے پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی؟

میں نے یہ تمام واقعات والدۂ سلطان کو بتا دیئے، اگرچہ دل ہی دل میں لرز رہی تھی کہ دیکھئے ان کا طرز عمل کیا ہوتا ہے۔ لیکن ان کے جواب نے میری پریشانی رفع کر دی۔ انہوں نے کہا۔

"تم نے بہت اچھا کیا! میں تو کہتی ہوں تم بڑی رحم دل ہو جو تم نے اس طرح اس کی جان لی، تمہاری جگہ میں ہوتی تو اس کے تکے بوٹی کر ڈالتی" اس سے کہیں ہلکے جرائم پر نہ جانے کتنی باندیوں کو میں قیمہ قیمہ کر چکی ہوں۔"

والدہ سلطان کے ان الفاظ نے میرا ذہنی بوجھ کم کر دیا۔ میں نے کوشش کی کہ اس حادثہ کو فراموش کر دوں۔ ——————

——————

(۴۳)

سلطان مراد کا قصہ

حالات ہر طرح سازگار تھے میرے راستہ کی رکاوٹیں تیزی سے دُور ہو رہی تھیں، لیکن حرم سرا میں سرگوشیوں اور سازشوں کا سلسلہ جاری تھا، ہر طرح محفوظ ہونے کے باوجود مجھے اپنی زندگی خطرہ میں معلوم ہوتی تھی، حرم سرا کی رہنے والیاں اپنی جگہ پر یہ طے کر چکی تھیں کہ بہت جلد میں سلطان کی محبوبہ بن جاؤں گی، اس یقین نے ان کی امیدوں کا دیا بجھا دیا تھا۔ ہم کبھی بھی آپس میں دوست نہ تھے۔ ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے جو کر سکتا تھا کرتا تھا۔

وزیر اعظم، خواجہ سرا چیف قادن اور دوسرے منصب داروں کا طرز عمل میری ہر دلعزیزی اور رسوخ کا شاہد تھا، ان سب کی طرف سے مجھے پورا پورا تعاون حاصل تھا، ان میں سے ہر ایک اپنا مستقبل میری ذات سے وابستہ سمجھنے لگا تھا۔

شام کی ٹھنڈی ہوا میرے رخسار سے ٹکرائی، اس چار دیواری کے اندر یہی ایک ... چیز تھی جو مصنوعی نہیں تھی۔

آج جب والدہ سلطان سے باتیں شروع ہوئیں تو انہوں نے سلطان مراد کا

قصہ سنایا جو رات کو فقیر کا بھیس بدل کر سارے شہر کے چکر لگاتا - اور لوگ جو باتیں اس کے خلاف کرتے انہیں نوٹ کر لیتا اور محل واپس آنے کے بعد وہ جلاد کے سامنے ان لوگوں کو کھڑا کر دیتا - اور وہ ان کا صفایا کر دیتا -

سلطان مراد کی ایک اور عادت یہ تھی کہ کسی لبِ ساحل کوشک میں بیٹھ جاتا، تیر کمان ہاتھ میں ہوتا جو شخص بھی ساحل کی طرف آتا دکھائی دیتا وہ نشانہ بنا دیا جاتا، لوگ اتنے دہشت زدہ ہو گئے تھے کہ اگر کوئی غریب شخص جو چہرہ سے فقیر نظر آتا لوگوں نے سلطان کے بارے میں کوئی گفتگو کرتا تو صرف ایک ہی جواب اسے ملتا۔

"سلطان زندہ باد ——————!"

---

(۴۴)

کینہ ہی کینہ

خواجہ سراؤں کے ذریعے ہمیں خبر ملی کہ سلطان کی محبوبہ مہری کا باپ ایک مرتبہ سلطان کی صحت کے بارے میں کسی سے بات کر رہا تھا، دوسرے دن جلاد کے سامنے محبوبہ سلطان کا باپ اور وہ لوگ جن سے وہ باتیں کر رہا تھا کھڑے تھے، تلوار چلی اور ان کی گردنیں کٹ کر گر پڑیں۔

بیچاری مہری ——— اس کی داستان بھی عجیب ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک یہ ایک باندی تھی، ایک گلعذرش کی لڑکی لیکن اب سلطان کے ایک لڑکے کی ماں بن گئی۔

یہ قسمت کا کھیل نہیں تو اور کیا ہے؟

اپنے باپ کے قتل ہونے کے ایک ہفتہ بعد صبح کو جب اس کی آنکھ کھلی تو سر میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر بے قرار ہو کر اس نے باندیوں کو آواز دی، اس کی حالت نازک سے نازک تر ہوتی جا رہی تھی۔

مہری نے باندیوں سے پوچھا۔

"بتاؤ کیا خبر ہے؟"

باندیوں نے جواب دیا

"نومولود بچہ جو ابھی ابھی اس دنیا میں آیا تھا مرگیا۔"

وہ بچہ جس نے ابھی دنیا کی کوئی بہار نہ دیکھی تھی اپنی ماں کو داغ جدائی دے کر رخصت ہوگیا تھا۔

مہری چلائی

"مجھے زہر دی گئی ہے، میرا بچہ بھی زہر سے ہلاک ہؤا ہے، میری حالت نازک ہوتی جا رہی ہے۔ خدا کیلئے ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

ڈاکٹر آیا اس کی تشخیص یہ تھی کہ مرض قلب کا حملہ ہؤا ہے، بھلا رنگ و حسد کے باعث جس کے ننھے سے بچے کو ہلاک کر دیا گیا ہو، اگر وہ بھی دل کے مرض میں مبتلا نہ ہوتی تو اور کون ہوتا؟

تھوڑی دیر کے بعد بچہ دفن کر دیا گیا۔ مہری سسکتی رہ گئی، اس کے بعد پھر کبھی اس کے ہونٹوں پر تبسم نمودار نہ ہؤا، وہ سوکھتی چلی گئی۔ سوکھ سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔ یہ وہی مہری تھی جو بہترین مغنیہ اور بہترین رقاصہ تھی، جس کی شوخ آنکھوں کے سامنے سلطان معظم تک نہیں ٹھہر سکتے، جس کے رخساروں کی رعنائی پھول سے زیادہ جاں بخش تھی، لیکن اب اس کی سحر طرازی رخصت ہو چکی تھی، وہ دنیا سے اور زندگی سے بیزار ہو چکی تھی، اور آخر ایک دن وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔

---

(۴۵)

ضمیر کی خلش

والدۂ سلطان بے خوابی کے مرض میں مبتلا ہوگئیں، رات رات بھر جاگتی رہتیں، اور باندیوں کو اپنے پاس بٹھائے رکھتیں، گذشتہ دو ماہ میں بار بار مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا تھا، یہ حاضری رات کو ہوتی تھی، جب چاہتیں بلالیتیں، قدرتی نیند سے میں بھی اس سارے عرصہ میں بغیر کسی بیداری سے محروم رہی۔

ایک رات جیسے ہی وہ سونے کے لئے لیٹیں، ایک باندی دوڑی دوڑی آئی اور اس نے کہا۔

"علیا حضرت ابھی اور فوراً آپ کو یاد کرتی ہیں"

یہ پیام سنتے ہی جھٹ پٹ تیز تیز قدم رکھتی میں ان کی خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ وہ سر پر ایک خاص قسم کا رومال باندھے بیٹھی تھی، اور میرا انتظار کر رہی تھیں۔

میں ان کے سامنے جا کر نظریں نیچی کئے کئے کھڑی ہو گئی، منتظر تھی کہ دیکھئے اب کیا فرماتی ہیں۔

والدۂ سلطان نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا۔

"نشاط خانم اپنے کمرہ میں جاؤ، لباس تبدیل کرو اور بن سنور کر میرے سامنے آؤ ——— جاؤ اور فوراً واپس آجاؤ۔"

ابھی چند دن پہلے والدہ سلطان نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جب وہ بلائیں میں جیسی بیٹھی ہوں ویسے ہی چلی آؤں، لباس تبدیل کرنے اور بننے سنورنے کی مجھے ضرورت نہیں ہے لیکن پہلے کی کہی ہوئی بات کا اس وقت یاد دلانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ والدہ سلطان کی یہ عادت تھی کہ ایک ہی بات پر کسی آدمی سے خوش ہو کر اسے نہال کر دیتیں اور اسی بات پر کسی آدمی سے خفا ہو کر کال کوٹھڑی میں بھیج دیتیں۔

میں نے کسی قسم کی گفتگو نہ کی، بھاگم بھاگ اپنے کمرہ میں پہنچی، جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ اور فوراً واپس آگئی۔ والدہ سلطان نے فرمایا۔

"بے انتہا سست ہو تم نشاط خانم! میرا یہ حال ہے کہ جیسے ابھی مری اور تم اس قیمتی وقت کو نہایت اطمینان سے بننے سنورنے میں ضائع کر رہی ہو ——— !"

یہ الفاظ سن کر میں کانپ گئی، میں نے عرض کی۔

"علیا حضرت میں آپ کی ایک باندی ہوں، آپ کا ہر حکم بجا لانا میرا فریضہ ہے۔ آپ کی صحت کے بارے میں جتنی میں فکر مند رہتی ہوں خدا ہی بہتر جانتا ہے، اپنی صحت کے بارے میں آپ نے اس وقت جس طرح فرمایا اس نے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، میری سست روی کو میری غفلت پر نہیں پریشان خاطری پر محمول کیجئے۔"

میری یہ باتیں سن کر والدہ سلطان نے اپنے کندھوں کو جلدی جلدی اوپر اور نیچے جنبش دی جیسے ایک بچہ مٹھائی پا کر خوشی میں اس طرح کی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ میرے جواب سے وہ مطمئن ہو گئیں انہوں نے ریشم کی چادر اوڑھ لی اور فرمایا۔

"تو بڑی اچھی لڑکی ہے ——— میں بیمار ہوں ذرا میرا خیال کیا کر۔"

میں نے دست بستہ عرض کی۔

"اگر اجازت ہو تو ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

میری اس تجویز سے انہوں نے اختلاف کیا، فرمایا

"نہیں! وہ صرف دوا دیں گے، آرام کی تاکید کریں گے، مجھے ان پر بھروسہ نہیں ہے۔ ایسا کرو کہ ایک خوراک ہاضمہ درست کرنے کے لئے میرے مخصوص نسخہ کی بنا دو۔ وہ نسخہ میں تمہیں دیتی ہوں۔ خبردار کسی اور کی نظر اس پر نہ پڑے، تمہاری اور بات ہے تم پر تو مجھے پورا بھروسہ ہے، شاباش! جاؤ جلدی سے بنا کر لاؤ، مجھے یقین ہے پھر مجھے نیند آجائے گی۔"

واقعی وہ بیمار نظر آرہی تھیں، چہرہ پر نقاہت اور کمزوری کے اثرات نمایاں تھے، میں جلدی سے عطار خانے میں پہنچی، اور چند منٹ میں نسخہ تیار کر لیا، جب خواب گاہ میں واپس آئی تو وہ بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں، اور کسی گہری فکر میں غرق تھیں۔

دوا لیجا کر میں نے ان کے سامنے رکھ دی، اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ اور نئے حکم کا انتظار کرنے لگی، انہوں نے فرمایا۔

"نشاط خانم!"

میں نے ادب سے جواب دیا۔

"علیاحضرت ——————!"

علیاحضرت نے اشارہ کیا

"کل جب تم میرے ہاتھ دیکھ رہی تھیں اور مستقبل کا حال بتا رہی تھیں تو تم نے مجھ سے کہا تھا، حلیم آغا بے گناہ ہے اسے معاف کر دینا چاہیئے۔ یاد ہے نا؟"——

میرے دل میں ایک انجانا خوف لہریں مارنے لگا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یاد ہے علیاحضرت ——————!"

کچھ سوچتے ہوئے وہ بولیں۔

"مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ اسے اذیت دے دے کر ہلاک کر دیا گیا ہے جب سے یہ خبر سنی ہے کسی پہلو قرار نہیں۔"

یہ ہولناک خبر سن کر میں خاموش کھڑی رہی، ذرا دیر کے بعد انہوں نے مجھ سے دریافت فرمایا۔

"کیا واقعی تمہارا خیال ہے کہ وہ بے گناہ تھا؟"

میں نے ایک لمحہ تامّل کے بعد جواب دیا۔

"اب یہ بحث بے کار ہے کہ وہ بے گناہ تھا یا خطا کار آپ نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی کیا۔"

میرے ان الفاظ سے انہیں تشفی ہوئی انہوں نے پوچھا۔

"کیا واقعی تمہارا یہی خیال ہے؟"

میں نے بے تامّل جواب دیا۔

"جی ہاں —————— یہ میرا عقیدہ ہے۔"

وہ خوش ہو گئیں، انہوں نے فرمایا۔

"تم بڑی اچھی لڑکی ہو، تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا —————— جاؤ سو رہو۔"

میں وہاں سے واپس آ کر بستر پر لیٹ گئی، —— لیکن نیند کا کہیں کوسوں پتہ نہ تھا۔

"وہ اذیت دے کر ہلاک کر دیا گیا۔"

یہ الفاظ ہتھوڑے کی طرح میرے دماغ پر لگ رہے تھے۔

میں سمجھ گئی والدۂ سلطان کی بے خوابی کا راز ضمیر کی خلش تھی نہ کہ دردِ سر یا کوئی اور مرض ہے۔

صبح ہوتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ علیاحضرت کے کمرہ میں پہنچی، وہ بےخبر اور گہری نیند سو رہی تھیں۔

جو دوا ان کے حکم سے میں نے تیار کی تھی وہ اسی طرح رکھی تھی، اس میں ہاتھ بھی نہیں لگا تھا۔

میری باتوں نے ضمیر کی خلش دُور کر دی تھی۔

(۴۶)

دارا غرق کردی گئی

حرم سرا کی زندگی عجیب و غریب، دہشت انگیز اور حیرت ناک واقعات سے پُر تھی۔ سلطاناؤں کے لئے دواؤں کا تیار کرنا بڑا اہم اور ذمہ داری کا کام تھا، ہر سلطانہ اپنا الگ نسخہ رکھتی تھی۔ اور اسے اس طرح چھپاتی تھی کہ جیسے اگر کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی ان میں سے بعض ایسی جڑی بوٹیاں استعمال کرتی تھیں کہ ان کی نظر بد کی طاقت بڑھ جاتی تھی۔

بعض مرتبہ ان دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے حیرت انگیز اثرات دیکھنے میں آتے تھے، جو لڑکی زیادہ خوبصورت ہوتی اس کے خلاف سکیمیں بنتی رہتیں، اور ایک دن وہ ایسی بیمار پڑتی کہ اسے ہسپتال پہنچانا پڑتا۔ وہاں جاکر اگر اچھی ہوجاتی اور ایسا بہت کم ہوتا تو خیر ورنہ وہاں سے ایسی غائب ہوتی کہ پھر اس کا پتہ نہ چلتا کہ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

حرم سرا میں ایک بے انتہا حسین و جمیل لڑکی دارا رہتی تھی۔ ایک مرتبہ سلطان معظم کی اس پر نظر پڑی، وہ انہیں پسند آئی، انہوں نے فرمایا۔

"رات کے کھانے کے بعد ہم تمہارا گانا سنیں گے۔"

یہ سُن کر غریب دارا کا حُسن بلاآشوب کچھ اور زیادہ چمک گیا۔ مسرّت اور

اور

انبساط کی لہریں اس کے دل سے اٹھنے لگیں، اس مخریر، وہ پھولی نہ سماتی تھی کہ آقا کی نگاہ التفات اس پر پڑی ہے اور بہتوں میں سے وہی ایک شرف باریابی کی مستحق ٹھہری۔

دارا نہانے دھونے اور آرائش وزیبائش کے کام میں مصروف ہو گئی، صرف ایک گھنٹے کے بعد اسے اپنے آقا کے حضور میں حاضر ہو کر اپنا کمال دکھانا تھا،

لیکن اس ایک گھنٹہ میں کیا گذر جائے گا۔ یہ کسے معلوم تھا؛ حرم سرا کی پراسرار زندگی کا یہ دل ہلا دینے والا واقعہ تھا۔

وقت مقررہ پر سلطان معظم حرم سرا کے باغ میں تشریف فرما ہوئے اور دارا کا انتظار کرنے لگے۔ اس بات پر وہ ذرا چیں بجبیں نظر آرہے تھے کہ معمول کے مطابق وہ ان سے پہلے کیوں نہیں حاضر ہوئی، بہر حال ایک آدمی اسے بلانے کے لئے بھیجا گیا ——————

لیکن وہ تو حرم سرا میں تھی ہی نہیں، کہیں اس کا پتہ نشان نہ ملا، ادھر سلطان کا یہ عالم کہ اس کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے وہ مضطرب ہو رہے تھے، اور اب ان کا اضطراب برہمی کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ ان کا چہرہ تمتا اٹھا اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے،

تھوڑی دیر کے بعد ایک مالی نے خبر دی کہ دارا تو باغ کے ایک تالاب میں ڈوبی پڑی ہے۔ اس کا چہرہ بگاڑ دیا گیا ہے، اس کا وہ شاندار لباس جو اس نے بڑے شوق سے پہنا تھا پارہ پارہ نظر آرہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مرنے سے پہلے دارا نے اپنی جان لینے والوں کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ اور اسی مقابلہ کی حالت میں اس نے جان دے دی۔

سلطان کے غیض وغضب اور برہمی کا یہ عالم تھا کہ وہ شعلہ جوالا بنے بیٹھے تھے۔

تحقیقات شروع ہوئی، خواجہ سراؤں نے شبہ میں ایک لڑکی کو گرفتار کیا اور اس کے تلوؤں پر بید مارنے شروع کئے۔ لیکن اس نے کوئی بات نہیں قبولی۔

اب اذیت رسانی کا سلسلہ شروع ہوا، اس کا سر ایک گہرے اور تاریک غار میں لٹکا دیا گیا۔ اس کے ٹخنے رسی سے باندھ دیئے گئے، اور اس سے کہا گیا، اگر اس

نے سچ سچ نہ بتایا تو یہ رسی جس سے اس کے ٹخنے بندھے ہوئے ہیں چھوڑ دی جائے گی اور وہ باسفورس کی سیاہ لہروں میں غوطے کھانے لگے گی۔

اس اذیت کی وہ لڑکی تاب نہ لاسکی، اس نے اقرار کرلیا۔

اس نے کہا کہ میں نے ایک قادن اور باندی کو باتیں کرتے سنا، قادن باندی سے کہہ رہی تھی، کیا اس نے ہدایت کے مطابق اپنا کام ختم کردیا، باندی نے جواب دیا۔ جی ہاں سب کچھ ٹھیک ہوگیا، یہ گفتگو ٹھیک اس وقت ہوئی تھی جب دارا یک بیک غائب ہوگئی تھی۔

فوراً ہی وہ قادن اور وہ باندی طلب کی گئیں، ان کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، رحم کی التجا کرتی ہوئی وہ آئیں، پولیس کے سپاہی انھیں قابو میں کئے ہوئے تھے فرمان صادر کیا گیا۔

"انھیں اذیت دے دے کر ہلاک کردیا جائے۔"

اور اس فرمان کی تعمیل میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہ ہوئی۔

اس حادثہ نے کئی دن تک میرے اعصاب کو بے قابو رکھا، میں نے اپنے دل میں سوچا، فرض کرو میرا کوئی دشمن ایسے ہی کسی حادثہ کے بعد سلطان سے یا کسلر آغاسے میرا نام لے دیتا۔ پھر کیا ہوتا؟ کیا میری قسمت کا فیصلہ بھی اسی سرعت سے نہیں کردیا جائے گا۔ جس طرح قادن اور باندی کا کیا گیا ہے؟

یہ ایسے حالات تھے کہ ہم نہ کسی سے محبت کرسکتے تھے، نہ کسی کے وفادار رہ سکتے تھے، نہ کسی سے دوستی کی پینگ بڑھا سکتے تھے، ہم میں سے ہر لڑکی دوسری سے اگر نفرت نہیں کرتی تھی تو شک وشبہ کی نظر سے ضرور دیکھتی تھی۔

ہم میں سے جو لڑکیاں اب کسی مرتبہ اور مقام پر فائز ہوچکی تھیں۔ اور اپنے الگ گوشک میں رہتی تھیں، کسی حد تک انہیں تحفظ حاصل تھا، لیکن لگائی بجھائی

کرنے والیاں، سازش کرنے اور اسکیم تیار کرنے والیاں کو بھی آخر کسی طرح زندہ رہنا تھا" اور ان کی زندگی کی بنیاد یہ تھا کہ وہ اپنے وجود کی ضرورت ثابت کریں اور اس کی صورت یہی تھی کہ اپنے آقا کو فرضی اور واقعی خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے کسی دوسری ہستی کو تعزیر و انتقام کا ہدف بنانے کی کوشش کریں۔

(۴۷)

عقوبت گاہ

حرم سرا کی زندگی میں ایک لمحہ بھی مجھے ایسا میسّر نہیں آیا جب میں نے اپنے آپ کو سازشوں، بیگموں اور جاسوسوں کے نرغہ سے آزاد پایا ہو۔ یہ جاسوس اتنی تیزی سے ہر جگہ پہنچ جاتے تھے، اتنی خاموشی سے جہاں چاہتے تھے چھپ رہتے تھے کہ ہر بات ان کے کانوں تک پہنچ کر رہتی تھی، پردہ کی آڑ میں یہ موجود، دروازہ کی اوٹ میں یہ پوشیدہ، دیوار میں سوراخ کر کے اور اسے کسی چیز سے ڈھک کے سن گن لینے میں یہ تاک! میرا خیال تھا کہ بہت سی بدقسمت اور بے گناہ ہستیاں جلاد کی تلوار کا شکار صرف اس لئے بن جاتی تھیں کہ جاسوسوں اور سازشیوں سے نجات حاصل کرنے کا ان کے پاس کوئی طریقہ نہیں تھا۔

اذیت دینے کے اتنے خوفناک اور لرزہ خیز طریقے اختیار کئے جاتے تھے جنہیں دیکھ کر روح دہل اٹھتی تھی، بے گناہ آدمی بھی اگر ان کے قابو میں آجائے تو اعتراف گناہ کر کے جلد از جلد مر جانا ہی آسان ترکیب تھی ظلم و ستم کے پنجہ سے آزاد ہونے کی۔

ایک عقوبت خانہ زیر زمین تیار کیا گیا تھا، یہ بالکل تاریک تھا، چھت کے

راخ سے ذرا سی روشنی آتی تھی، کیونکہ یہ سوراخ ایک بہت بڑے پتھر کی وجہ سے جو
ب رسّی میں لٹک رہا تھا کافی تنگ ہو گیا تھا، مجرم اس تہ خانہ میں داخل کیا جاتا اور بڑے
یک پتھر کے تیچے لاکر کھڑا کر دیا جاتا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ ادھر اُدھر بھاگنے کی کوشش
یا لیکن کہاں جاتا؟ اسی اثنا میں پتھر کی رسّی ڈھیلی کر دی جاتی اور وہ پتھر اتنے زور سے
گرا اس کے سر اور بدن کے پرخچے اڑ جاتے۔

اذیت رسانی کی ایک اور بے انتہا ہولناک ترکیب یہ تھی کہ مجرم کو آئینہ خانہ
پہنچا دیا جاتا۔

چھت پر، دیوار پر، فرش پر، داہنے بائیں، آگے پیچھے اوپر نیچے ہر طرف آئینے
آئینے نظر آتے، جدھر بھی اس کی نظر اٹھتی وہ اپنے آپ کو دیکھتا، اس طرح کچھ عرصہ
بعد اس پر دیوانگی طاری ہو جاتی، اس کی آنکھوں سے وحشت برسنے لگتی اور وہ بڑا بھیانک
ہنسنے لگتا، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک محافظ اس کے سامنے آکے بغیر دریافت

"پانی چاہئیے؛ کھانا کھاؤگے؟"

لیکن ان سوالوں کا جواب ایک بھیانک قہقہے کے بغیر کچھ نہ ملتا، وہ بھوک
نڈھال ہو جاتا، پیاس سے تڑپنے لگتا، آئینوں میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کر پاگل ہو جاتا،
اس غیر انسانی اذیت پر محافظ کڑھنے کی بجائے لطف لیتے، مجرم کو ستانا ان
کا تفریحی مشغلہ تھا، یہاں تک کہ ایک روز ٹکرا ٹکرا کر وہ مجرم اپنی جان دے دیتا۔

(۴۸)

زہر دے دو

دارا کی ہلاکت کے بعد ایک سلطانہ بھی بیمار پڑ گئیں، ان کی عمر کافی تھی، انہیں لڑکے کی بڑی تمنا تھی لیکن اتنی عمر گذرنے کے باوجود گود خالی ہی رہی، لڑکے کی ماں بننے کیلئے ایک پوشیدہ نسخہ یہ استعمال کیا کرتی تھیں، جو ان کی ایک باندی نے انہیں عطا کیا تھا،

سلطانہ نے مجھے بلایا اور اصل مقصد چھپاتے ہوئے کہا۔

"آج کل مجھے درد سر کی اکثر شکایت ہو جایا کرتی ہے، یہ نسخہ ذرا تیار کرا لاؤ۔"

لیکن والدہ سلطان اڑتی ہوئی چڑیا پہچان لیتی تھیں نہیں جب نسخہ کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے فوراً کہہ دیا۔ یہ نسخہ کس لئے تیار کرایا جا رہا ہے؟ یہ بات انہیں کس طرح معلوم ہوئی؟ میں نہیں جانتی، پوچھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی تھی، لیکن اس معلومات کو بھید کے طور پر استعمال کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"دیکھو میں نے کس طرح پتہ چلا لیا ہے! بہرحال میں سلطان کی ماں ہوں۔"

یہ کہتے کہتے وہ تن کر بیٹھ گئیں۔

حرم سرا میں والدہ سلطان کے مخصوص آدمی ہر جگہ اور ہر کہیں موجود رہتے تھے،

ایک روز مساج کے دوران میں میری ایک باندی نے کہا۔

"جو بات بھی ہمارے منہ سے نکلتی ہے وہ ہوائیں اڑ کر والدۂ سلطان کے جاسوسوں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔"

یہ سن کر میں حیران رہ گئی، لیکن خاموشی کے سوا چارہ کیا تھا؟

ایک روز انہوں نے مجھ سے فرمایا۔

"ذرا وہ نسخہ تو دکھانا جو سلطانہ نے تمہیں بنانے کے لئے دیا تھا۔"

میں عجب چکر میں پڑ گئی، ایک طرف یہ دہشت کہ یہ خبر ضرور سلطانہ تک پہنچ جائے گی، دوسری طرف اس بوڑھی عورت کا اندیشہ کہ اگر چاہے تو ابھی میرا سر قلم کر دے

میں نے گول مول سا جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ نسخہ عطار خانہ کے ایک مقفل بکس میں رکھا ہے۔ کیا آپ مجھے اجازت دیتی ہیں کہ جا کر لے آؤں؟"

انہوں نے فرمایا

"ہاں اجازت ہے۔"

اب میں سوچنے لگی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ راستہ بھر یہی سوال میرے دماغ میں گردش کرنے لگا۔ میں جانتی تھی نسخہ وہاں نہیں ہے۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نسخہ کی ایک ایک دوا مجھے زبانی یاد ہے؛ میں نے سوچا مجھے کہہ دینا چاہئے کہ نسخہ وہاں نہیں ملا، بات ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ واپس آ کر میں نے عرض کیا۔

"علیا حضرت! نسخہ تو وہاں نہیں ہے؟"

بڑی سادگی سے انہوں نے فرمایا۔

"اگر وہاں نہیں ہے تو نشاط خانم تمہارا یہ خوبصورت سر جو ہے اس میں تو ہے بتا دو۔"

یہ سن کر میں ہکا بکا رہ گئی، میں نے رکتے رکتے کہا

"علیاحضرت! ——————"

لیکن قبل اس کے کہ میرا جملہ پورا ہو، علیاحضرت نے فرمایا۔

"ہاں! میں جانتی ہوں، تمہارا دل سب کے ساتھ رسم وفا کا پابند ہے، تم جاربیا کی رہنے والی لڑکیوں کو خدا نے یہ عجیب چیز مرحمت کی ہے، لیکن میری ایک بات سن لو میں اس سلطانہ سے نفرت کرتی ہوں، یہ کافی جی چکی، اس کا جن کب تک اس کی حفاظت کرے گا؟"

میں نے عرض کیا۔

"علیاحضرت آپ نے جو کچھ فرمایا میں نے سن لیا"

جواب میں علیاحضرت نے کہا

"صرف سننے سے کیا ہوتا ہے، سمجھ بھی لیا؟"

میں نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"نہیں! علیاحضرت نہیں! ——————"

بڑی بے پروائی سے انہوں نے کہا۔

"جب ایک آدمی کافی عرصہ تک جی لے تو پھر اسے مر جانا چاہیئے۔ میں تم سے بڑی صفائی سے یہ بات کہہ رہی ہوں لیکن پوشیدہ طور پر کیونکہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں، مجھے تم پر بھروسہ ہے —————— ہاں اب بتاؤ تو سہی اس نسخہ کے اجزا کیا کیا ہیں؟"

اب میرے اندر مقابلہ کی طاقت نہیں رہی تھی، میں نے نسخہ بتا دیا، نسخہ سننے کے بعد علیاحضرت نے کہا۔

"ٹھیک ہے اب اس میں ایک دوسرا نسخہ بھی شامل کر لو"

میں لرزنے لگی، میری یہ کیفیت دیکھ کر وہ ہنس پڑیں، انہوں نے فرمایا

"جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے، میرا بیٹا سایۂ خدا ہے، کیا میں نے اسے جنم نہیں دیا ہے۔ لہٰذا میرا حکم سایۂ خدا اور خدا کا حکم ہے!"

یہ سن کر میری عجیب حالت ہو گئی، یہ عورت چاہتی ہے کہ میں ایک عورت کو قتل کر دوں، یا اللہ! میرے اوپر رحم کر! بھلا ایک بے گناہ عورت کو زہر دے کر میں کس طرح ہلاک کر سکوں گی؟ کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں، یہ زہر کی پڑیا جو اس عورت نے مجھے دی ہے اسے کیا کروں؟

میں اپنے کمرہ میں واپس آ گئی، میں نے اپنی یہ اندرونی کیفیت باندیوں پر ظاہر نہیں ہونے دی، ایسا معلوم ہوتا تھا میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی، اتنا بڑا پاپ میں کسی طرح نہیں کر سکتی۔ میرے دل میں والدۂ سلطان کے لئے نفرت کا سمندر لہریا مارنے لگا، دنیا میں کسی شخص سے بھی مجھے اتنی نفرت نہیں تھی جتنی اس بوڑھی عورت سے۔ اگر میں نے اس کا حکم مان لیا تو میں قاتل بن جاؤں گی۔ میں نے وہ زہر کی پڑیا اپنے زیورات کے صندوقچہ میں چھپا لی۔ یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں میرے سوا کسی اور کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ہر صبح جب میں طلب کی جاتی تو پہلا سوال والدۂ سلطان یہ کرتیں کہ آیا وہ زہر میں نے سلطانہ کے نسخہ میں ملا دیا؟

جب میں اپنے سر کی جنبش سے یہ جواب دیتی کہ نسخہ تیار نہیں ہوا ہے تو وہ چیں بجبیں ہو جاتیں اور وہ مجھے اس طرح نظر آتیں جیسے ایک چڑیل!

ایک روز سلطانہ کا ایک پیامی یہ حکم لے کر آیا کہ سلطانہ نے نسخہ مانگا ہے۔ میں اس وقت نسخہ ہی تیار کرنے کا کام کر رہی تھی، یہ سن کر جو بوتل میرے ہاتھ میں تھی۔ ہاتھ کانپا اور وہ سنگ مرمر کے فرش پر گر کر چور چور ہو گئی۔ یہ بدشگونی کی علامت تھی۔ میں گھبرا گئی، لیکن دل ہی دل میں خوش بھی ہوئی کہ اس عورت کی موت میرے ہاتھ سے

نہیں ہے "جس نے مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ اتنے میں ایک باندی آئی اور اس نے کہا،

"سلطانہ کا انتقال ہو گیا ہے"

یہ سنتے ہی مجھ پر بجلی گر پڑی۔

"سلطانہ مر گئی"———— یہ الفاظ بار بار میرے منہ سے نکلتے تھے

مجھ نہ سکوں ان کا مطلب کیا ہے؟———— یہ الفاظ دوہراتے

دوہراتے میں فرش پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

جلد ہی ہوش میں آگئی۔———— میری باندیاں اضطراب کے عالم میں

میرے ہاتھ پاؤں سہلا رہی تھیں، سر پر اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دے رہی تھیں۔

فوراً ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں کیوں بے ہوش ہوئی تھی! پہلا ردِ عمل

تو مجھ پر بہت خوشگوار ہوا، یہ کہ گو سلطانہ اپنی جان سے گئی، لیکن میں بچ گئی۔

بے چینی اور اضطراب کے ساتھ والدہ سلطان کی طلبی کا میں انتظار کرنے لگی

———— کیا انہیں یقین ہے کہ سلطانہ کا انتقال اس زہر سے ہوا ہے جو انہوں نے مجھے دیا تھا، لیکن سارا دن گذر گیا، مگر ان کی طرف سے کوئی بلانے نہیں آیا۔ جب سے میں ان کی معتمد بنی تھی اور ہم نے شطرنج کھیلنا شروع کیا تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ سارا دن گذر گیا، مگر انہوں نے مجھے یاد نہیں کیا۔

یہ سارا دن نزع کے عالم میں مجھ پر گذرا، یہاں تک کہ دوسرا دن بھی گذر گیا۔

اور کوئی مجھے بلانے نہیں آیا۔

میں سوچنے لگی کہ کیا میں ان کے دل سے اتر گئی ہوں، اور کیا میرا وہ دور ایک عارضی لہر تھا۔ یہ تو میں ہمیشہ سے جانتی تھی کہ وہ کرب سے بھری ہوئی عورت ہیں لیکن آج معلوم ہوا کہ وہ بے حد چالاک بھی ہیں۔

تیسرے دن میرا یہ بوجھ ہلکا ہوا، آج رات کو شطرنج کھیلنے کے لئے یاد فرمایا!

گیا تھا۔

سارادن بڑی کش مکش میں گذرا، کبھی سوچتی آیا میں جاکر وہاں سے واپس بھی آسکوں گی؟ ممکن ہے انہیں یہ گمان ہو کہ میں نے ان کی دی ہوئی دوا، سلطانہ کو نہیں دی ایسا کیوں ہوا؟

والدۂ سلطان کا جو آراستہ پیراستہ کمرہ مجھے کبھی جنت کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا، آج جہنم کدہ نظر آرہا تھا۔

رات آئی —————— اور وہ وقت بھی جو میری حاضری کے لئے مقرر کیا گیا تھا!

میں نے لباس اور آسائش کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، جیسے بیٹھی تھی ویسے ہی اٹھ کر چلی گئی ——————

وہ اس طرح مجھ سے پیش آئیں جیسے مجھے جدا ہوئے تین دن نہیں، صرف ایک گھنٹہ گذرا ہے۔ وہ اس وقت بہت چونچال نظر آرہی تھیں، فوراً ہی کھیل شروع ہوگیا۔ میری چالیں غلط جا رہی تھیں، اتنا خراب کھیل میں نے کبھی نہیں کھیلا تھا، میرا خیال تھا سب سے پہلے وہ سلطانہ کے معاملہ پر گفتگو کا آغاز کریں گی۔ لیکن تین بازیاں پے بہ پے کھیل لی گئیں، اور ایک لفظ بھی ان کے منہ سے نہ نکلا، میرا دل دھڑک رہا تھا —— کیا یہ اسی طرح خاموش رہیں گی۔ مطلب کی ایک بات بھی ان کے منہ سے نہیں نکلے گی۔ —————— لیکن آخر کیوں؟

تیسری بازی کے بعد اس خاموشی سے میں اتنی پریشان و مضطرب ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا اب بیہوش ہوا چاہتی ہوں۔ میں لمبی لمبی سانس لینے لگی۔ انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ بساط اٹھا دیا جائے۔

"میں تھک گئی ہوں!" انہوں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"آپ آرام فرمائیے!" میں نے ادب کے ساتھ جواب دیا۔

"نشاط خانم میری دعا ہے کہ تم بھی آرام اور سُکھ کے ساتھ یہ رات گزارو!"

علیاحضرت نے فرمایا

میں رخصت ہو کر اپنے کوشک کی طرف بڑھی، سوچا جاتے ہی بستر پر گر پڑوں گی، آج کی یہ ساری رات بھی بے چینی میں گزارنا پڑے گی، ایک لمحہ کے لئے بھی پلک نہیں جھپک سکے گی۔ اس بوڑھی لیکن انتہائی ہوشیار اور چالاک عورت ہے۔ مجھے عجیب ضغطہ میں ڈال دیا تھا۔

چلتے چلتے میں نے کہا۔

علیاحضرت میں اجازت چاہتی ہوں۔

پھر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"سلطانہ

انہوں نے تیوری چڑھا کر مجھے دیکھا اور پوچھا

"کیا کہنا چاہتی ہو؟

میں نے عرض کیا "سلطانہ ———— اُن کا انتقال ہو گیا نا؟"

جمائی لیتے ہوئے فرمایا

"ہاں میں نے تمہاری کمزوری دیکھ کر وہ کام کسی اور سے لے لیا، یہ تمہارے بس کا روگ نہ تھا"

یہ الفاظ سننے کے بعد گرتی پڑتی، میں اپنے کوشک میں واپس آئی، اور بستر پر دراز ہو گئی، درد سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا، میری باندیاں میرے ہاتھ پاؤں اور سر دبانے لگیں، لیکن میرے دل پر کیا گذر رہی تھی، اس کا اندازہ میرے سوا اور کون کر سکتا تھا؟

"کوئی نہیں!"

---

(۴۹)

مصنوعی بچہ

دوسرے دن صبح ام کی تو طبیعت بھاری تھی، جاگنے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب دیکھ رہی ہوں، جی چاہا کہ سارا دن بستر پر ہی گزارا دوں کوشش یہ ہے کہ باہر قدم نہ نکالوں، نہ کوئی [illegible]، بہرحال خیال آیا کہ یہ مناسب نہ ہوگا، خدا جانے ہم [illegible] چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی اور بات کا بتنگڑ بن جائے گا، بہت سی مجھ سے [illegible] کے مجھے [illegible] سے جلد کر [illegible] جائیں گی [illegible] کا موقع نہیں دینا [illegible] لہٰذا [illegible] اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

مجھے [illegible] ایک [illegible] میں [illegible] [illegible] اپنی [illegible] ہوئے

ہر روز اس خاتون کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کھاتے

تھے، انہیں چاندنی رات میں توڑا جاتا، کچھ ایسی بوٹیاں تھیں جو صرف جنگلوں میں پروان چڑھتی تھیں، انہیں جنگل جنگل تلاش کیا جاتا، کوئی مخصوص قسم کی ریت تھی، جو بہت دور سے لائی جاتی، ایک مقدس تالاب کا کیچڑ تھا، جو بڑی جدوجہد کے ساتھ حاصل کیا جاتا، ایک مزدور کی خاک حاصل کرنے کے لئے بڑی دوڑ دھوپ سے کام لیا جاتا، پھر جب یہ سب چیزیں فراہم ہو جاتیں تو مخصوص قسم کا غسل شروع کیا جاتا اور اس کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہتا، اس عرصہ میں اس بات کا بڑی سختی سے لحاظ رکھا جاتا کہ قادن کے پاؤں زمین پر نہ ٹکنے پائیں، اسے گود میں بستر سے اٹھایا جاتا، پھر گود ہی میں اُسے غسل دیا جاتا، پھر اسی طرح وہ اپنے بستر پر لائی جاتی، اس کی غذا بھی بدل دی گئی تھی، اس کی حفاظت کا بڑا سخت انتظام کیا گیا تھا، چوکی پہرہ پہلے سے زیادہ سخت کر دیا گیا تھا، باندیوں اور خادماؤں کو منہ مانگے انعامات دیئے جا رہے تھے، قادن نے تھیلی کا منہ کھول دیا تھا، اور بے دریغ روپیہ صرف کر رہی تھی،

یہاں تک کہ ایک روز مجھے اطلاع ملی کہ قادن کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے، اس خبر نے سارے حرم سرا میں ایک چہل پہل کی سی کیفیت پیدا کر دی نشاط و مسرت کی لہر ہر طرف دوڑ گئی، انعام و اکرام کی بارش ہونے لگی، نجومی عورت جس نے یہ علاج کیا تھا اور اس سلسلہ میں بڑی کھکھیڑ اٹھائی تھی، مالا مال کر دی گئی جو باندیاں اس عرصہ میں مصروف خدمت رہی تھیں، ان کی جھولیاں سیم و زر سے بھر دی گئیں، قادن نے اس تقریب سعید کے موقع پر مٹھیاں بھر بھر کر اشرفیاں صرف کیں تاکہ اس کی خوشی میں ہر کوئی دل سے شریک ہو سکے۔

یہاں تک تو خیر و خوبی کے ساتھ سارے مرحلے طے پا گئے۔

لیکن اب ایک نئی بات آ کھڑی ہوتی، حرم سرا میں یہ قاعدہ

تھا کہ سلطان کی خدمت میں باریابی کا دن ہر مرتبہ نوٹ کر لیا جاتا تھا، پھر جب اولاد پیدا ہوتی تو سابقہ تاریخوں کے اندراجات سے مطابقت کرنے کے بعد نومولود کا نام درج رجسٹر کر لیا جاتا، حرم سرا میں باقاعدہ ایک محکمہ رجسٹری اس مقصد کے لئے قائم تھا، چنانچہ بچّہ کی ولادت کے بعد جب رجسٹرار اپنا رجسٹر لے کر حاضر ہوا اور اسنے تاریخوں کے اندراجات دیکھے تو جس تادن کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تھا، اس کا نام ہی درج رجسٹر نہ تھا، تادن سے جب پوچھ گچھ ہوئی تو اس نے کہا،

"یہ مختلف قسم کا لڑکا ہے، آپ اسے عام اصولوں پر جانچنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ نتیجہ ہے، دعاؤں، اداؤں اور جادوئی علاج کا، پریوں اور نیک روحوں کی مہربانی کا،

لیکن ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں کی گئی، اسے حرم سرا کی عدالت میں پیش کیا گیا،

لیکن تادن حرم سرا کی عدالت میں بھی اپنی بات پر اڑی رہی، لیکن جج نے تادن کی بات نہیں کاٹی، اس نے کہا۔

"یہ جادو کی باتیں اپنے ہی پاس رہنے دو۔ صاف صاف بتاؤ، یہ لڑکا کیسا ہے اور کس کا ہے؟"

تادن نے کہا،

"یہ میرا لڑکا ہے، اور خدا نے اپنی خاص مہربانیوں سے مجھے عطا کیا ہے!"

جج نے فیصلہ صادر کر دیا،

"یہ لڑکا جن معلوم ہوتا ہے، بہرحال اسے اور اس کی خودساختہ ماں کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔"

قسمت کا کرشمہ پھر اپنی جھلک دکھاتا ہے

شدہ شدہ قادن اور اس کے لڑکے کے موت کی سزا کی خبر شہر میں پھیل گئی۔ جیسے ہی یہ خبر ایک باندی نے سنی، وہ روتی پیٹتی، چلاتی ہوئی، یہ ایک معصوم اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا حال زار دیکھ کر اور اس کے گریہ بے اختیار پر سلطان کو ترس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح قادن نے اسے رشوت دی اور انعامات کا لالچ دیا۔ ثبوت میں اپنی بھتیجی اور زیورات جو اسے عطا کئے گئے تھے، اٹھائے اور بتایا کہ یہ بچہ اس کی مرحوم بہن کا ہے جس کا دوران زچگی میں انتقال ہو گیا تھا وہ سیدھی سلطان معظم کی خدمت میں پہنچی اور یہ سارا ماجرا بیان کر کے، پھر رونا دھونا شروع کر دیا۔ اس نے سلطان کو بھی وہ زیورات دکھائے جو قادن نے رشوت اور انعام کے طور پر اسے دیئے تھے،

ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت خاموشی کے ساتھ قادن کو زمین سے آسمان پر پہنچا دی گئی یعنی ہلاک کر دی گئی!

اور وہ بچہ اس کی خالہ کو واپس کر دیا گیا۔

---

(۵۰)

میرا معلّم

عام ترقی کے ساتھ ساتھ، ہر شعبۂ حیات میں میری ترقی کا سر و سامان بہم پہنچایا جاتا تھا، جو ذمہ داریاں مجھے تفویض کی گئی تھیں، ان کے علاوہ میرے لئے معلم بھی رکھے گئے تھے، جو مجھے باقاعدہ درس دیتے تھے، اور مختلف علوم و فنون کی مجھے تعلیم دیتے تھے، جس انہماک اور توجہ سے میں اپنی سرکاری ذمہ داریاں انجام دیتی تھی، اسی شغف اور محبت سے اپنے استادوں کا دیا ہوا سبق بھی یاد کرتی تھی، اور ان کے لیکچروں کو بھی اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتی تھی۔

ہر روز دو گھنٹے تک مجھے قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی تھی!

قرآن مجید کی تعلیم دینے جو مولوی صاحب آتے تھے، وہ عمر رسیدہ آدمی تھے، ان کی سفید نورانی داڑھی اب تک مجھے یاد ہے، وہ مجھ سے دور ہٹ کر بیٹھتے تھے، کیونکہ آداب کا تقاضہ یہی تھا، اتنی لمبی عبا پہنتے تھے، جس کے دامن زمین کو چھوتے ہوئے چلتے تھے، سبز رنگ کی پگڑی استعمال کرتے تھے، یہ اس بات کی علامت تھی کہ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کا پر خطر راستہ طے کر کے اور اپنی

ن کی کیفیت اور حالت پر بھی وہ روشنی ڈالا کرتا تھا، وہ یہ بھی بتایا کرتا تھا کہ اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کس ستارے میں وہ اپنا نشیمن بنائے گا اور کہاں کی مستقل بود و باش اختیار کرے گا!

چند ماہ کے بعد اس فلسفی اور ستارہ شناس معلم کا انتقال ہو گیا ——— ٹھیک اسی دن اور اسی گھڑی جس کی اس نے کافی پہلے پیشین گوئی کر دی تھی،

میری تعلیمی رپورٹ والدۂ سلطان کی خدمت میں برابر بھیجی جاتی تھی، اور ان کی باتوں سے میں اندازہ لگاتی رہتی تھی کہ میری تعلیم سے وہ خاص دلچسپی بھی لیتی ہیں، ان کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ پچاس برس پہلے کی باتیں، دن تاریخ، وقت کی قید کے ساتھ انہیں اس طرح یاد تھیں، جیسے یہ واقعہ ابھی چند منٹ پہلے گزرا ہو!

جان جوکھوں میں ڈال کر حج اور روضۂ نبوی کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں، وہ اس وقت ـ کلمۂ آیۂ کریمہ دوہراتے رہتے، اجنبی تک صحیح تلفظ کے ساتھ بالکل اسی عربی لب ولہجہ میں جو ان کا تھا، میں وہ الفاظ ادا نہیں کرنے لگتی تھی،

دوسرا سبق مجھے خطاطی اور خوش نویسی کا دیا جاتا تھا۔

اس کام پر بھی ایک سمرقندی صاحب مامور تھے، لیکن فن خطاطی میں مانے ہوئے استاد تھے،

ایک اور معلم تھا ———— یہ فلسفی اور ستارہ شناس تھا، !

یہ معلم مجھے فلسفہ کا سبق دیتا اور ستارہ شناسی کا فن سکھاتا۔ یہ ستاروں کی دنیا کے بارے میں سب کچھ مجھے سکھاتا، انکا حجم، زمین سے، انکا فاصلہ، ہماری زندگی اور قسمت پر ان ستاروں کی گردش کے اثرات انکی رفتار کا راز سمجھنا انکی زبان پہچاننا، ان کے ارادوں کو جاننا ان کے پیغامات سے واقف ہونا، اور اسی سلسلہ میں پیدا شدہ اہم اور نازک سوالات کے جوابات دینا۔ جنہیں عام طور پر لوگ نہیں جانتے ————

یہ ساری گُر کی باتیں میرا یہ معلم پوری تندہی اور جاں فشانی کے ساتھ مجھے سکھاتا اور بتاتا، یہ مجھے بتاتا کہ کون سے دن ہمارے خطرناک ہو سکتے ہیں، اور ان کے خطرہ سے کس طرح بچا جا سکتا ہے؛ یہ بھی بتاتا کہ کون سے دن ہمارے لئے سعد اور مبارک ہو سکتے ہیں، اور ان کی برکت میں کس طرح مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے؛ اسے یہ بھی معلوم تھا کس دن اور کس گھڑی اس کا انتقال ہو گا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ اس دنیا کا نہیں ستاروں کی دنیا کا آدمی ہے۔ اور زمین کو ایک عارضی قیام گاہ سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ایک دن وہ، اور اس دنیا کے پنجرے میں رہنے والا ہر "قیدی" ستاروں کی دنیا میں واپس جائے گا اور وہیں مستقل طور پر رہے گا، جن ستاروں میں زندگی کے آثار و علائم موجود تھے

(۵۱)

قِسمت کا کھیل

ایک روز حسبِ معمول بساط بچھی ہوئی تھی، اور بازی ہو رہی تھی کہ والدہ سلطان نے جو کھیل کے دوران میں کسی گہرے خیال میں غرق تھیں، مجھ سے کہا۔

"ذرا اپنی باندیوں کو بلاؤ!"

ذرا دیر میں وہ آگئیں، علیا حضرت نے انہیں بیش بہا ملبوسات دیئے اور کہا کہ میرے ڈریسنگ روم میں رکھ آئیں جاکر، جب وہ چلی گئیں، تو مجھ سے فرمایا "کل کوئی کام نہ کرنا، خوب اچھی طرح اپنی آرائش کرنا اور شام کے کھانے کے بعد مجھ سے آکر ملنا۔"

میں نے عذر پیش کیا،

"لیکن علیا حضرت کئی سلطاناؤں کی طرف سے مختلف آرڈر آئے پڑے ہیں، ہم ان کی تعمیل جو کرنا ہے!"

ذرا تیکھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرا حکم سب پر بالا ہے!"

سارا دن میری باندیاں بہترین قسم کا غازہ تیار کرتی رہیں، نہایت اعلیٰ درجہ کی خوشبویات، انہوں نے تیار کیں، بالکل نیا اور تازہ اور نہایت بہترین قسم کا ہیرآئیل بنایا، میں دن بھر لباس کا انتخاب کرتی رہی، آخر میں نے ایسا لباس منتخب کر لیا، جو واقعی کسی شہزادی کو زیب دے سکتا تھا، میری باندیوں نے محنت کا حق ادا کر دیا، ہر چیز اتنی عمدہ اور اعلیٰ بنائی کہ میں داد دینے پر مجبور ہو گئی، میں جانتی تھی کہ یہ سب خبریں حرم سرا میں گشت کریں گی، انہیں کہانی کی طرح باربار ایک دوسرے سے بیان کیا جائے گا۔ یہ سوچ سوچ کر عجیب طرح کا احساس برتری میرے اندر پیدا ہو جاتا ———— مجھ سے جلنے والی عورتیں اور زیادہ جلیں گی، اور میں کتنی خوش ہوں ———— میری خوشی حد بیان سے باہر تھی،

دن آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا!

میری باندیاں میری آرائش و زیبائش میں لگی تھیں، میں خود بھی اس فن میں کچھ کم ماہر نہ تھی، ان بیچاریوں نے بھی مجھے سنوارنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو ذرا مبالغہ نہ ہو گا کہ انہوں نے اپنی آرائش و زیبائش سے مجھ میں چار چاند لگا دیئے، میں نے اپنی آرائش کے دوران میں جھوٹ موٹ "نالائقی" پر ان باندیوں کو جھڑکا بھی، اور ان کے کام میں خامیاں بھی نکالیں، تاکہ یہ باتیں بھی مجھ سے حسد کرنے والیوں تک پہنچیں، اور وہ اندازہ کریں کہ مجھے راضی رکھنا کتنا مشکل ہے۔

شام کے کھانے کے کوئی آدھے گھنٹہ بعد میری طلبی ہوئی،

میں والدۂ سلطان کے شبستانِ راحت کی طرف بڑھی، جذباتِ مسرت کی شدت نے مجھے تھوڑا سا گھبرا دیا تھا ———— میں سوچ رہی

تھی آخر آج کیا ہونے والا ہے۔ اس طلبی کا ضرور کوئی خاص مطلب ہے، عزیز بی کے بعد اس دنیا میں میرا کوئی دمساز نہیں رہ گیا تھا جسکے سامنے اپنے دل کی بات زبان پر لاسکتی،

یہی سوچتی ہوئی میں والدہ سلطان عالی شان کے دربار ہال میں پہنچی وہ ایک زر نگار کرسی پر ایک تپائی پر پاؤں رکھے تشریف فرما تھیں، ان کے لباس میں سینکڑوں ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ان کی طرف دیکھنا ایسا ہی تھا جیسے ٹھیک دوپہر میں سورج کی طرف دیکھنا۔

میں نے ان کے دامن کو بوسہ دیا، پھر ادب سے جھک کر سلام کرتی ہوئی پیچھے ہٹی،

میں نے دیکھا چار اور لڑکیاں بھی میری طرح سولہ سنگار کئے کھڑی ہیں، ان کے حسن و جمال پر بھی آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی، سچی بات تو یہ ہے کہ یہ جنت کی حور معلوم ہوتی تھیں۔

پھر حبیث خواجہ سرا کے حکم سے ہم میں سے، ۔ ۔ ۔ ۔ ہر ایک لڑکی باری باری معائنہ کے لئے علیا حضرت کے سامنے سے گزری اسکے بعد ہم سب پھر اپنی اپنی جگہ آ کر کھڑے ہو گئے

پھر ہم سے کہا گیا،

"اب جاؤ اور جمعہ کے دن بعد نماز پھر بالکل اسی لباس میں ملبوس ہو کر اور اسی طرح بن سنور کر حاضر ہونا اس روز تمہیں یہ اعزاز حاصل ہو گا کہ فرماں روائے عالم و شاہ دیان سلطان معظم کے حضور میں تنہیں باریاب ہونے کی سعادت حاصل ہو گی،

ہم سب نے سر جھکا کر یہ حکم سنا اور واپس لوٹے،

دروازہ پر پہنچکر ہم نے تین مرتبہ فرشی سلام کیا، اور چلے آئے۔

یہ ہفتہ عجیب طرح سے گذرا ـــــــــــــــــــــ حرم سرا کا ہر فرد خواہ وہ خواجہ سرا ہو، یا غلام، قادن ہو یا معمولی باندی، پولیس کا افسرِ اعلیٰ ہو یا ایک پہرہ دار، سب اس طرح جھک جھک کر مجھ سے ملتے تھے، گویا میں ان میں ایک بہت بڑی ہستی ہوں، اور تو اور خود والدہ سلطان کا طرزِ عمل، اب میرے ساتھ تقریباً مساویانہ تھا، جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

جمعہ سے ایک دن پہلے یعنی جمعرات کو رات کے وقت والدۂ سلطان نے مجھ سے فرمایا۔

"شاید تم نے سُنا ہو کہ خاقان ابن خاقان، سلطان ابن سلطان ظل اللہ، یعنی ہمارے سلطان معظم کی محبوبہ کا انتقال ہو گیا!"

میں نے غم انگیز لہجہ میں جواب دیا،

"نہیں علیا حضرت ـــــــــ یہ غم انگیز خبر ابھی ابھی میں نے سُنی ہے!"

"غم انگیز!" ـــــــــــــ یہ لفظ نہایت حقارت کے ساتھ اُنہوں نے دہرایا۔

پھر ذرا دیر خاموش رہ کر اُنہوں نے فرمایا۔

"مجھے تو اس خبر سے ذرا غم نہیں ہوا۔ خدا نے اسے یہاں بھیجا تھا، اسی نے اپنے پاس واپس بلا لیا، اللہ اللہ خیر صلا! ـــــــــــــــــــ وہ ایک خوبصورت عورت تھی، کسی حد تک ذہین بھی تھی، لیکن بدذات بھی تھی میں نے ہی اس مرتبہ تک پہنچایا تھا لیکن سربلندی حاصل کرتے ہی اس نے آنکھیں بدل لیں اُس نے اپنے طور طریقے سے میری زندگی اجیرن کر دی، اُس نے طے کر لیا تھا کہ ہر بات وہ کرے گی جو میری مرضی کے خلاف ہو، اس نے مجھے ایک کھیل بنا لیا تھا، یہاں تک کہ میری شخصیت مجروح ہو گئی میرا وقار خاک میں مل گیا۔ میں نے بڑے

ضبط سے کام لیا، سب کچھ سہتی رہی، لیکن اپنے بیٹے سے کوئی شکایت نہیں کی"

ان باتوں میں درد تھا، سوز تھا، میں بہت متاثر ہوتی، میں نے کہا۔

"کرنی چاہیئے تھی!"

ایک ٹھنڈی سانس لے کر انہوں نے کہا،

"خدا بہتر جانتا ہے، وہ بیچارہ خود اپنی پریشانیوں میں گرفتار ہے، امور سلطنت، نظم مملکت، بہت سے ملکوں کا انصرام، یہ ذمہ داریاں ایک آدمی کی کمر توڑ دینے کے لئے کافی ہیں، ان سارے مصائب کو وہ تن تنہا جھیلتا ہے۔ کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں، حتیٰ کہ میں تک جو اس کی ماں ہوں اس کا بوجھ نہیں بٹا سکتی"

یہ کہتے کہتے اس بوڑھی عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ کہنے لگی،

"میں ایک عمر رسیدہ عورت ہوں، عمر کا بوجھ میرے لئے اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے، اس دنیا میں میری صرف ایک ہی آرزو، ایک ہی خواہش ہے، میرا بچہ خوش رہے ——————— !"

یہ آخری جملہ تمام تر خلوص محبت اور سچائی کا آئینہ دار تھا ——————

یہ الفاظ اس عورت کے منہ سے نکلے تھے جو اپنی روزمرہ کی زندگی میں خلوص، محبت اور سچائی سے ناآشنا تھی ——————— آج اتنے سال گذر جانے کے بعد بھی یہ الفاظ اپنی پوری اثر انگیزی کے ساتھ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں، اس نے اپنے "بچہ" کے سوا علیا حضرت نے کسی اور بارے میں کوئی بات نہیں کی، یہ بچہ جو ساری دنیا کی نظر میں شہنشاہ دوراں، فرمانروائے عالم، اور ظل اللہ تھا، لیکن ماں کی نظر میں "بچہ" ! ——————— آج اس بوڑھی علیا حضرت کی ماتا میں اور ایک معمولی عورت کی ماتا میں کوئی فرق میں نے نہیں دیکھا۔

اس گفتگو کے بعد دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

علیا حضرت اپنی فکر میں کھوئی ہوئی تھیں، اور میں بھی عالم بیداری میں نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھ رہی تھی۔

پھر انہوں نے فرمایا۔

"میں ایک بہت شاندار مسجد بنانا چاہتی ہوں۔"

میں نے عرض کیا۔

"بڑا مبارک ارادہ ہے۔"

کہنے لگیں۔

"میری خواہش ہے کہ مسجد اتنی عمدہ اور شاندار ہو کہ دُور دُور سے لوگ اسے دیکھنے آئیں۔"

میں نے کہا۔

"آپ کی بنائی ہوئی چیز ایسی ہی ہو گی ——— پھر خلوص اور حسنِ نیت کا کرشمہ کیا کچھ کم ہوتا ہے، دیکھ لیجئے خلقت ٹوٹ پڑے گی اُسے دیکھنے کے لئے۔"

علیا حضرت میری ان باتوں سے خوش ہو گئیں۔ فرمایا۔

"پانی کی طرح اس کارِ خیر پر روپیہ بہا دوں گی۔"

میں نے کہا،

اس کے بدلے میں فردوس بریں بھی تو آپ کے حصے میں آئے گی۔"

مسکرانے لگیں، پھر فرمایا۔

"کافی رات آ گئی ہے، جاؤ اب میٹھی نیند سو رہو۔"

(۵۲)

کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

آج جمعہ کا دن تھا، ! ——— وہ دن جس کا انتظار کرتے کرتے آنکھیں تھک گئی تھیں۔

سارا دن بار بار آئینہ کے سامنے جا کر میں اپنا جائزہ لیتی۔ آیا، میرے انداز و روش اور سجاوٹ بالکل حسب حال ہیں یا نہیں؟ حرم سرا میں، جو عورت انداز و عشوہ کی تعلیم و تربیت پر مامور تھی کئی گھنٹہ تک وہ مجھے اٹھنے، بیٹھنے، کھڑے ہونے، بات کرنے، مسکراتے جواب دینے کی تعلیم دیتی رہی۔ ترکی زبان میں نے ابھی حال تنہا میں سیکھی تھی اور اس زبان میں ابھی کچی تھی، وہ بے چاری میرا لب لہجہ اور تلفظ بھی درست کراتی رہی، میرا درس نغمہ بہت کامیاب رہا۔ مجھے ترکی زبان کے کئی گیت یاد تھے جن میں عشق و محبت کی چاشنی تھی۔ اپنی مادری زبان کے گیتوں کی تو میں حافظ تھی۔ اپنے طور پر میں بہت مطمئن تھی کہ خواہ ابھی، مجھے سلطان کے سامنے پیش کر دیا جائے کسی سے ہیٹی نہیں

رات ہوئی!

والدۂ سلطان کا پیامی بلانے کے لئے آیا، میں پورے اطمینان اور اعتماد

کے ساتھ دربار ہال میں پہنچی، یہاں وہ چاروں لڑکیاں بھی موجود تھیں، جنہیں میرے ساتھ حضور سلطان میں پیش ہونا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کسلر آغا ہمیں لے کر چلا، ہم آغا کے پیچھے آہستہ آہستہ چلتے رہے یہاں تک کہ ایوانِ شاہی میں پہنچ گئے۔ یہ وہ محترم مقام تھا، جہاں بے اجازت دنیا کی بڑی سے بڑی ہستی بھی قدم نہیں رکھ سکتی تھی، یہ کمرہ قابل دید تھا اس کی شان و شوکت، اس کی سجاوٹ، اس کے قالین، اس کے جگمگاتے ہوئے ہیرے اور جواہرات جو نگینوں کی صورت میں دیواروں پر اور چھت میں جڑے ہوئے تھے، سب چیزیں ایسی عقل کو حیران کر دینے والی تھیں کہ بس کیا کہوں؛

اسی طرح کے مختلف شاندار کمروں میں ہوتے ہوئے ان کی آراستگی، آباد اور شان پر عقل و روح کی دولت نچھاور کرتے ہوئے، ہم ایک طلائی دروازہ کے سامنے پہنچے، یہاں پہلے ایک دستہ نا بجائی گئی، پھر دو آدمی نمودار ہوئے، انہوں نے گھنٹی بند بجایا اور اب اس کمرہ میں ہم نے قدم رکھا۔ جہاں کی جگمگاہٹ سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ اتنے شاندار، ایوان کا تصور کرنا بھی، ہم جیسے لوگوں کے لئے ناممکن تھا یہ کمرہ کیا تھا، ایک دنیا تھی، شکوہ و جلال کی، یہاں کی ہر چیز، اپنا جواب آپ تھی، دیواروں پر سونے کے پتر جڑے ہوئے تھے، چھت بھی اسی طرح کی تھی، دیواروں پر اور چھت پر بے شمار زمرد، یاقوت، نیلم، پکھراج اور دوسرے جواہرات جگمگا رہے تھے،

تھوڑی ہی دیر کے بعد گھڑی نے آدھا بجایا، ساتھ ہی دوسری تمام گھڑیاں جو اس ایوان میں اور نیز ملحقہ تھیں بجنے لگیں، تب ہمیں معلوم ہوا یہ سلطان کی عادت ہے، انہوں نے بہت سی گھڑیاں جمع کر رکھی ہیں، جو سب ایک وقت، ایک ساتھ بجتی ہیں اور یہ آواز سلطان کو بڑی بھلی لگتی ہے۔

سلطان ذی جاہ ابت تک تشریف نہیں لائے تھے، ہم سب ادب سے سر جھکائے کھڑے تھے، والدۂ سلطان بھی اپنے عملہ کے ساتھ تشریف لے آئی تھیں، صرف اُنہی کی ایک ایسی ہستی تھی، جو تخت شاہی کی طرف دیکھ سکتی، ورنہ کسی اور کی نہ یہ مجال تھی، نہ ہمت، ہم انہیں دیکھ کر ہم سب نے اپنے ہونٹ، پیشانی اور آنکھوں کو انگلیوں سے چھوا، انہوں نے اشارہ سے ہمارے سلام کا جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد قربانچی اور چیف خواجہ سرا حاضر ہوا، اُس نے ایک ایک گوشہ کی تلاشی لی کہ خدانخواستہ سلطان کی سلامتی تو خطرہ میں نہیں ہے، ممکن ہے، کسی دشمن نے کوئی خطرناک بم چھپا دیا ہو۔

سارے کمرہ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی گھڑیوں کی ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی،

اتنے میں باہزاراں جاہ و تمکنت سلطان عالی شان تشریف لائے، اپنی والدہ کو دیکھ کر انہوں نے ادب سے سر جھکایا، پھر تخت پر آ کر جلوہ فرما ہو گئے ——————— ہم ظل اللہ کے سامنے کھڑے تھے!

ذرا دیر کے بعد سلطان تخت شاہی سے نیچے اُترے اُن کے ہاتھ میں گلاب کے دو پھول تھے، والدہ آگے بڑھیں سلطان نے وہ دونوں پھول اور کچھ اشرفیاں بطور نذر کے پیش کیں، جنہیں والدہ نے خوشی کے ساتھ قبول کیا - اس کے بعد وہ پھر آ کر تخت پر بیٹھ گئے، پھر والدہ ڈائس پر تشریف لے گئیں اور انہوں نے اپنے بیٹے کو جو شہنشاہ بھی تھا نذر پیش کی،

سلطان نے نذر پر ہاتھ رکھ دیا، یہ قبولیت کی علامت تھی، والدہ نذر کی اشرفیاں اور پھول وہیں چھوڑ کر پھر اپنی جگہ واپس تشریف لے آئیں،!

ہم میں سے کوئی بھی سلطان کا نظارہ نہ کر سکا کیونکہ ہماری یہ حیثیت نہ تھی

کہ ظل اللہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکیں، نظر اٹھانا اور سر کو جنبش دینا آداب کے خلاف تھا۔

اس کے بعد وزیر اعظم وزراء دولت اور دوسرے منصب داروں نے نذر پیش کی، ان لوگوں نے نذر میں پھول پیش کئے، جو قبول کر لئے گئے۔

اس کے بعد پھر ایک مرتبہ قرنا بجی اور صدر دروازہ کھول دیا گیا، فوراً ہی خوش ادا رقاصاؤں کا ایک طائفہ آیا اور کمرہ کے وسط میں جو فوارہ تھا اس کے گرد رقص کرنے لگا، یہ رقص کرنے والی خوب صورت تھیں اور خوش ادا بھی، سارا کمرہ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا، اور ان میں سے ہر رقاصہ خود بھی ایک خوبصورت پھول ہی تو تھی، ان کا رقص بے محابا، واقعی خاصا نوخیز تھا اپنے بدن پر انہیں اتنی غیر معمولی قدرت حاصل تھی کہ جہاں سے چاہیں موڑ لیں، توازن کا یہ عالم تھا کہ صرف ایک انگلی پر کھڑی ہو کر اس طرح ناچتی تھیں، جیسے کمہار کے چاک پر بھر کی ناچتی ہے۔

رقص کا پہلا دور ختم ہوا تو سلطان معظم نے کسلر آغا کو حکم دیا اور اس نے ان سے کہا کہ تخت کے سامنے کی نشست پر بیٹھ جائیں۔

ان میں سے ہر مغنیہ اور ہر رقاصہ آج اپنی قسمت پر نازاں تھی، سلطان ذی شان کے سامنے حاضر ہونا اور اپنا کمال دکھانا اتنا بڑا فخر تھا جس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ہر دور کے بعد گانے والی اور ناچنے والی لڑکیاں تخت کے سامنے آکر سر جھکاتیں، سلطان ہاتھ کے اشارہ سے خوشنودیٔ مزاج کا اظہار فرماتے اور وہ الٹے پاؤں واپس جاتیں۔

رات کے دس بج گئے۔

گانے والیوں اور ناچنے والیوں کا طائفہ رخصت ہو گیا،!

چیف خواجہ سرا ہمارے پاس آیا۔ اور ہم پانچوں میں سے ایک لڑکی سے مخاطب ہو کر گانے کا حکم دیا،

وہ اٹھی، تخت کے سامنے خمیدہ ہوئی، پھر والدۂ سلطان کے سامنے سر جھکایا، اس کے بعد ایک ذرا سی غزل اس طرح گائی کہ سارے ایوان پر سناٹا چھا گیا۔

پھر دوسری لڑکی کی باری آئی، اس نے ستار اٹھایا، اور ایک ترک گیت کی لَے پر اسے بجانا شروع کر دیا۔ اس کے کمالِ فن نے بھی سب کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

اب میری باری آئی،

ایک سکنڈ کے لئے تو میں گھبرا سی گئی، لیکن بہت جلد اپنی اس کیفیت پر غالب آگئی۔ میں نے اُسے فراموش کر دیا کہ کہاں ہوں؟ اور کس کے سامنے ہوں، پرشاندار ایوان میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ میں اپنے وطن جا رہی ہوں، اور ایک پہاڑی کے دامن میں بیٹھی گا رہی ہوں،

گانا ختم کر کے میں پھر اپنی جگہ آ بیٹھی، اور پھر محسوس کرنے لگی کہ کہاں ہوں اور کس کے سامنے،

اتنے میں چیف خواجہ سرا میرے پاس آیا اور اس نے دوبارہ وہی گانا گانے کا حکم دیا،

میں نے حکم کی تعمیل کی،

پھر کسلر آغا نے سلطان معظم کی طرف سے ہمیں انعام میں اشرفیاں دیں، اس کے بعد ہم میں سے ہر ایک کو فوارہ کے سامنے سے گذرنے کا حکم دیا، جہاں روشنی کا بھی فوارہ چھوٹ رہا تھا،

سلطان والاشان تخت سے اُترے اور ہمارے پاس تشریف لائے ۔
اب میں نے جھجکتی ہوئی نظر سے انہیں دیکھا، عمر تو کوئی پچاس کے لگ بھگ ہوگی لیکن نہایت شاندار اور باوقار، سیاہ بال، خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، جن میں افسردگی جھلک رہی تھی، لباس بالکل سادہ، پھر بھی رعب و جلال کا یہ عالم کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ اُن کی طرف دیکھنے کی جرأت کر سکتا۔

سلطان والاشان مجھے دیکھ رہے تھے۔

میرا چہرہ فرطِ شرم سے تمتما اُٹھا، ان کے ہاتھ میں ایک رومال تھا جو اُنہوں نے میرے پاؤں پر گرا دیا۔

فوراً ہی وہ تشریف لے گئے، اُن کے جاتے ہی چیف خواجہ سرا آیا، اس نے بڑھ کر وہ رومال اُٹھایا، اور مجھے دے دیا۔

یہ ایک معمولی رومال تھا، لیکن میری زندگی کی سب سے قیمتی پونجی تھا، یہ اس بات کی علامت تھا کہ سلطان والاشان نے اپنی محبوبہ کی حیثیت سے مجھے منتخب کر لیا، فوراً ہی ہر چہار طرف سے مبارکباد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا میں نشاط سلطانہ اب ایک باندی نہیں تھی، دنیا کے سب سے بڑے تاجدار خاقان ابن خاقان سلطان ابن سلطان، ظل اللہ کی منظورِ نظر تھی۔

اس موقع پر عزیزی ہوتی تو ضرور خوش ہوتی اور دل سے مجھے مبارکباد دیتی، لیکن مبارکباد کے الفاظ اس وقت جن زبانوں پر جاری تھے، جھوٹے بول رہی تھیں یہ مجھ سے اور میری وجہ سے نفرت کرنے پر مجبور تھیں، ان الفاظ میں خلوص نہ تھا، سچائی نہ تھی، جھوٹ تھا، فریب تھا، ان کا بس چلتا تو مجھے ابھی ہلاک کر دیا جاتا۔

اب وہ چار لڑکیاں جو میری طرح امید و آرزو سے معمور دل لے کر

یہاں آئی تھیں ——————— یہ بھی مبارکباد دے رہی تھیں، لیکن میں جانتی تھی یہاں سے جانے کے بعد یہ مجھے کوسیں گی، اور اپنا لباس فاخرہ تار تار کردیں گی" اور جوش و انتقام سے بے قابو ہو کر نئی اسکیمیں مجھے تباہ و برباد کرنے کی بنانا شروع کردیں گی"!

---

(۵۳)

میں سُلطان کی منظورِ نظر بن گئی

وزیرِ اعظم نے جب وہ رومال میری طرف بڑھایا، میں اُسے ہونٹوں تک لائی اور اُسے بوسہ دیا، پھر پورے وقار کے ساتھ ایوان کے ہر گوشہ پر میں نے ایک نظر ڈالی اور خمیدہ ہو کر ممنونیت کا اظہار کیا، پھر چیف خواجہ سرا مجھے لے کر پہرے کمرہ میں آیا۔

یہاں پہنچنے کے بعد میری باندیاں فرش پر لوٹ لوٹ کر میرا دامن اور میرے جوتے چومنے لگیں، یہاں تک میرے نقشِ پا کو بھی اُنہوں نے بوسہ دینا شروع کیا، وہ کہہ رہی تھیں،

"خدا آپ کو عمرِ دراز عطا فرمائے، بہت سے بچے دے، ایک روز آپ والدہ سلطان بن جائیں، اپنی ان باندیوں کو جو آپ پر جان چھڑکتی ہیں، کبھی فراموش نہ کر دیجئے گا، ہم ہر وقت آپ پر قربان ہونے کو تیار ہیں۔"

——— میرا خیال ہے کہ باندیوں کے منہ سے جو الفاظ نکلے، وہ ان کے دل کے ترجمان تھے، حرم سرا کی اس وسیع دنیا میں خلوص کی پونجی صرف انہی کے پاس تھی۔

محبوبۂ سلطان کے قصر عالی شان میں مجھے منتقل کرنے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ میں سوچنے لگی، ذرا سی دیر میں کتنا بڑا انقلاب آگیا، اب میں سلطان کی منظورِ نظر ہوں، لیکن میری یہ پوزیشن کتنی ہی عالیشان ہو بہرحال عارضی ہے۔ اس سے پہلے بھی کچھ عورتیں تھیں جو اس منصب پر فائز رہ چکی تھیں، ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ میں نظر سے گذر جاؤں اور حرم سرا کی کوئی معمولی سی باندی میری جگہ لے لے یا کسی دن میرا بھی اسی طرح آناً فاناً خاتمہ ہو جائے، جس طرح اس کا ہو گیا آج جس کی جگہ پر میں فائز تھی، لیکن یہ خیالات ہوا کی طرح آئے اور گذر گئے، اپنی حسرت کو ان تاریک خیالات سے میں مجروح کرنا نہیں چاہتی تھی،

میں جانتی تھی حرم سرا کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ اب میرا دشمن ہو چکا ہے، میں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ والدہ سلطان بھی اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھیں، اب نشاط خانم ان کے لئے ایک معمولی باندی نہ تھی، بلکہ اپنے وقت کی سلطانہ تھی جس کے ہاتھ میں قوت اور اقتدار کی باگ تھی، نشاط خانم جو پہلے ان کے ڈر سے نہ جانے کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سبب بن چکی تھی نہ جانے کتنے آدمیوں کو کال کوٹھری بھجوا چکی تھی، لیکن اب وقت بدل چکا تھا، اب نشاط کسی کی دبیل نہیں تھی، زمانہ اس کے آگے سرنگوں تھا، اور وہ زمانہ پر حکمران تھی

میں سوچنے لگی کہ اگر مجھ میں ان نیت کا شائبہ بھی ہے تو وقت آگیا ہے کہ شاہی کانوں تک ان بدقسمت لوگوں کا حال زار پہنچادوں، جو اب تک کال کوٹھری میں پڑے سڑ رہے ہیں اور انہیں رہا کرا دوں۔

سامنے مصلیٰ بچھا تھا، میں نے دو رکعت نماز شکرانے کی ادا کی اور خدا سے اپنی کامیابی اور کامرانی کی دعا مانگنے لگی، اتنے میں میرے کانوں میں میری ایک باندی کی سہمی ہوئی آواز آئی جو کسی سے کہہ رہی تھی،

"خاموش! سلطانہ نماز پڑھ رہی ہیں"

میں جانماز سے اٹھی۔ لیکن میرا دل ایک نئے حوصلہ سے معمور تھا۔

اے رحیم و کریم خدا! اے سب سے زیادہ توانا اور طاقت ور، اے دنیا کے خالق اور مالک! میرے اوپر رحم کر! مجھے سچے راستہ پر لے چل!

جس وقت میں خدا سے رحم و کرم کی بھیک مانگ رہی تھی مجھے کیا معلوم تھا کہ میری آئندہ زندگی میں رحم ایک ایسی چیز بن جائیگا جس سے مجھے بہت کم واسطہ پڑیگا۔

چیف خواجہ سرا نے اعلان کر دیا کہ اپنے کوشک سے میں اپنے قصرِ عالیشان میں منتقل ہو رہی ہوں۔ میں رخصت ہونے لگی تو میری باندیاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ دعا التجا کر رہی تھیں کہ میں انہیں اپنے ساتھ لے چلوں۔ لیکن خواجہ سرا نے ٹھوکر مار کر انہیں پیچھے ہٹا دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے دالانوں کے اندر سے ہوتی گزر رہی تھی۔ یہ وہی راستہ تھا جس پر مجھ سے پہلے نہ جانے کتنی سلطانائیں اسی طرح گزر چکی ہیں۔

میں اپنے قصرِ عالیشان میں پہنچ کر متحیر رہ گئی۔ یہ محل تھا یا جنت کا ٹکڑا کسی حور کا نشیمن، کسی پری کی گذرگاہ۔ قالین اتنے دبیز کہ پاؤں ان میں دھنس جاتے تھے، میز کرسی تپائی، صوفہ، ہر چیز سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے مرکب۔ ہاتھی دانت کی چیزیں، مرمر اور دوسرے قیمتی پتھروں سے بنا ہوا سامان آرائش اتنا زیادہ تھا کہ اس کی کیفیت بیان کرنا آسان نہیں۔

یہ ساری چیزیں میری تھیں، میری ـــــــ اس وقت تک جب تک انہیں گرفت میں رکھنے کی میرے اندر طاقت ہو۔ میں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ قوت و طاقت بھی گردش کر رہی ہے۔ اتنے میں نئی باندیاں آئیں اور زمین پر نظر جما کر کھڑی ہو گئیں۔ ان میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ میری طرف دیکھ سکتیں۔ چیف خواجہ سرا نے مجھے محل کا ایک ایک گوشہ دکھایا۔

جب میں اپنے محل کے آراستہ پیراستہ، مرصع اور شاندار ہال میں داخل ہوئی تو توپوں کی گھن گھرج سنائی دی، سارا محل ہلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، میں نے سوالیہ نظروں سے خواجہ سرا کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا

"شاہ سلطانہ! یہ آپ کے اعزاز میں چھوڑی جا رہی ہیں۔

یہ سن کر مجھ پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ میرے اعزاز میں توپیں چھوڑی جا رہی ہیں۔ میرے پاؤں ڈولنے لگے۔ لیکن میں نے خواجہ سرا پر اپنی یہ جذباتی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی رہیں اسی طرح سنجیدہ اور باوقار بنی کھڑی تھی جس طرح ایک شہزادی کو ہونا چاہیئے۔

جس کمرہ میں بھی گئی حسن و آرائش اور دولت و ثروت کے مظاہرے مجھے نظر آئے۔ سب سے زیادہ عجیب چیز میرا بستر تھا۔ جسے دیکھتے ہی چین کی نیند سونے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ اس کی روغن کشتی سے ملتی جلتی تھی۔ یہ جھولے کی طرح چھت سے لٹک رہا تھا۔ پائے اور پٹیاں سونے کی تھیں جن میں ہیرے اور جواہرات اپنی جھلک دکھا رہے تھے۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"کتنا خوبصورت!"

پھر میں نے خود ہی اپنے دل سے کہا۔

"بے شک حرم سرا کی   خاتون کے لئے یہ موزوں ترین خواب گاہ ہے"

اتنے میں والدہ سلطان کی خاتون آئی۔ اس نے مجھے اس نئے اعزاز پر مبارکباد دی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ کہنے لگی۔

"میں اپنا دل آپ کے قدموں پر رکھنے کے لئے لائی ہوں"

میں نے درباری زبان میں شاہانہ تمکنت کے ساتھ جواب دیا۔

" تمہارے ان الفاظ میں وہ ٹھاٹھ ہے، جو دل میں اتر جانے والی موسیقی میں ہوتی ہے "

وہ جھکی اور سلام کر کے رخصت ہو گئی۔ میں نے معائنہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ کئی گھنٹوں تک میری نئی باندیاں مجھے گھیرے رہیں۔ میں اپنی شان جتانے کے لئے بار بار انہیں جھڑکتی اور ناراضگی کا اظہار کرتی۔ مجھے خوش کرنے کے لیے وہ جتنی بے کل ہو رہی تھیں اسے دیکھ کر دل ہی دل میں لطف لیتی جاتی تھی۔

میرے ملبوسات اب اتنے ہی شاندار تھے جتنے والدہ سلطان کے۔ اب میرے پاس جواہرات کا وہ خزانہ تھا جو کسی کے پاس نہ تھا سلطان کے سوا۔ اب کسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی مجھے پروا نہ تھی۔ میں نے ہر قیمت پر اس اعزاز کو اپنے قبضہ میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سلطان کی نظر سے اتر کر اگر مجھے پھر حرم سرا میں واپس جانا پڑتا، تو ایسی زندگی سے موت بہتر تھی۔

باندیاں میری آرائش میں مصروف تھیں کہ کئی غلام متعدد بکس لے کر جو ہاتھی دانت، آبنوس اور دوسری قیمتی چیزوں کے بنے ہوئے تھے، میرے سامنے لائے، انہوں نے تین مرتبہ زمین تک سر جھکا کر مجھے سلام کیا اور کہا۔

" یہ سلطان کا تحفہ ہے "

میں نے حکم دیا۔

" میرے محل کی چیف قادن کہاں ہے؟ اس کو بلاؤ "

وہ فوراً دوڑی دوڑی آگئی اور گردن جھکا کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی، میں نے شان و تمکنت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

" سلطان معظم کے یہ تحفے میز پر پھیلا دو تاکہ میں دیکھ سکوں "

یہ تحائف قدر و قیمت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ نہایت بیش قیمت ہیرے

اور جواہرات ۔ نادر اور نایاب موتیوں کی کئی کئی لڑیاں، ہیرے کی کنگیاں، یاقوت اور زمرد کی بوتلیں جن میں تیل اور عطر رکھا ہوا تھا، سونے کے تاروں سے سی ہوئی سلیپر، سفید فر کی ٹوپی، طرح طرح کے زیورات، سر کے لئے، ہاتھ کے لئے، گلے کے لئے، بازو کے لئے، قیمتی پتھروں کے بنے ہوئے پھولدان، ہاتھی دانت کے بنے ہوئے لیمپ، جن میں ہیرے کے نگینے جگمگا رہے تھے گھڑیاں ہر قسم کی، ہر رنگ کی، ہر وضع کی۔ ان چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ۔

میرے دل سے آواز آئی، یہ سب چیزیں میری ہیں۔ دل میں خوشی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اپنی باندیوں کے سامنے میں اس شان اور وقار سے مسکرا رہی تھی۔ جیسے یہ معمولی چیزیں ہیں اس طرح کے تحائف میرے لئے کوئی خاص وقعت اور اہمیت نہیں رکھتے ۔

آج میں یہ دیکھ دیکھ کر حیران اور مسرور ہو رہی تھی کہ یہ چیف خواجہ سرا جس کے ہاتھ میں بڑی بڑی ہستیوں کا عروج و زوال تھا میرے سامنے اس طرح کھڑا تھا کہ جس طرح ایک معمولی غلام ۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص آکر ادب سے میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ میرا خاص چیف خواجہ سرا ہے اور اس کا نام قاسم ہے۔ میں نے سر کی جنبش سے اس کا سلام قبول کیا اور اسے رخصت کر دیا ۔

(۵۴)

چیلنج

تھوڑی دیر کے بعد قاسم میرے پاس آیا اور اس نے کہا۔

"والدۂ سلطان آپ کی خدمت میں تشریف لانا چاہتی ہیں۔"

یہ خبر اگر ایک دن پہلے مجھے ملی ہوتی کہ وہ میرے غریب خانہ پر تشریف لا رہی ہیں تو میرے اضطراب اور فخر کا کیا عالم ہوتا! لیکن آج؟ —— نہ فخر تھا نہ اضطراب!

یہ جو کچھ ہو رہا تھا میں اس طرح محسوس کر رہی تھی جیسے اسے ہونا ہی چاہیئے۔ میں ان کا انتظار کرنے لگی۔ زیادہ تر اس لئے کہ وہ آئیں اور دیکھیں کہ اب میں کیا ہوں؟

وہ تشریف لائیں، لباس فاخرہ میں ملبوس، اور گراں بہا جواہرات سے مزین، لیکن میرا لباس ان سے کب کم تھا، میرے جواہرات کہیں زیادہ گراں بہا تھے۔

ہم دونوں نے پیش قدمی کر کے مساوی طور پر ایک دوسرے سے گرمجوشی کے طور پر ملے۔

والدہ سلطان نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا:

"واقعی تم اس نئے اعزاز کی پورے طور پر مستحق ہو۔ اس انتخاب لاجواب پر

میں اپنے آپ کو مبارک باد دیتی ہوں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

والدہ سلطان نے فرمایا۔

"شاید تم نہیں جانتیں کہ سلطان کو کسی خوبصورت اور حسین و جمیل لڑکی کی طرف متوجہ کر کے منتخب کرنے میں مدد دینا میری ذمہ داری ہے۔"

میں نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"علیا حضرت! مجھے یہ بات معلوم نہ تھی۔"

"علیا حضرت نے فخر اور اطمینان سے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا "میں بہرحال سلطان معظم کی والدہ ہوں۔ خدا کے بعد سارے اختیارات مجھے حاصل ہیں۔"

یہ کہہ کر کچھ عجیب عارفانہ انداز میں علیا حضرت نے چھت کو تکنا شروع کر دیا۔ میں نے عرض کیا۔

"آپ بجا فرماتی ہیں علیا حضرت، میں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کروں گی۔"

علیا حضرت نے ارشاد فرمایا

نشاط سلطانہ! حقیقت کسی کو بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے۔"

درحقیقت والدہ سلطان کے یہ الفاظ ایک طرح کا چیلنج تھے۔ یہ بوڑھی اور اقتدار کی بھوکی عورت سارے حرم سرا میں اپنے جاسوسوں کا جال پھیلاتے ہوتے تھی، اپنے بیٹے کی منظور نظر خاتون کو یہ ہمیشہ اپنے اقتدار و سطوت کے راستہ میں حائل سمجھتی تھی، اور اسی لئے بہت جلد اس کی دشمن ہو جاتی تھی، میں نے اس کے چیلنج کا مطلب سمجھ لیا، لیکن خاموش رہی۔

علیا حضرت نے ان تحفوں پر ایک نظر ڈالی جو میرے سامنے ڈھیر تھے۔ اور بتاتی رہی کونسی چیز کس جگہ پر رکھی جا سکے۔ پھر انہوں نے فرمایا۔

"میں ہمیشہ ہر طریقہ پر تمہاری مدد کر کے خوشی محسوس کروں گی، مجھے امید ہے تم بھی میری تائید کرو گی۔"

علیا حضرت کی آواز میں خفیف سی لرزش میں نے محسوس کر لی۔ انہوں نے مجھ سے آنکھ نہیں ملائی، میں نے ہمت کر کے کہا:

"یہاں بہت سی باتیں ہوتی رہتی ہیں، نہ جانے کیا کیا سننے میں آتا رہتا ہے۔ لیکن میں انہیں زبان پر لانا پسند نہیں کرتی۔"

علیا حضرت نے فرمایا۔

"ٹھیک ہے ایسا کبھی کرنا بھی نہیں! اس طرح کی باتیں صرف مجھ سے کیا کرو، پھر ہم دونوں مل کر سلطان کی بھلائی کی باتیں سوچا کریں گے۔"

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر علیا حضرت نے اپنی باندی کو آواز دی، وہ باندی رومال میں لپیٹے ہوئے کوئی چیز لے کر اندر داخل ہوئی۔ اور لا کر اس نے میرے پاؤں کے پاس رکھ دیا، پھر فرشی سلام کرتی پیچھے ہٹ گئی، والدہ سلطان نے فرمایا۔

"یہ میری طرف سے تحفہ ہے" میں نے وہ رومال کھولا، اس کے اندر سے ایک سونے کا صندوقچہ نکلا جس پر پھولوں کی صورت کے جواہرات جڑے ہوئے تھے میں نے وہ بکس کھولا تو اس کے اندر اور کئی چھوٹی چھوٹی ڈبیاں تھیں۔ ایک میں ہیرے دوسری میں یاقوت، تیسری میں نیلم باقی ڈبیوں میں اور بہت سے بیش بہا پتھر جو ابھی تراشے نہیں گئے تھے، موجود تھے۔

یہ کئی لاکھ پونڈ کے جواہرات دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں، مجھ پر سرور و نشاط کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ کچھ نہ کہہ سکی، علیا حضرت نے فرمایا

"میں دیکھ رہی ہوں، میرے اس تحفہ سے تم بہت خوش ہو، دربار کے چھ جوہری

صرف تمہاری خدمت کے لئے وقف کر دیئے گئے ہیں، انہیں جاؤ اور اپنی مرضی اور پسند کے مطابق جس طرح کا ڈیزائن چاہو ترشوا لو۔ آج سلطان نے ایک شاندار جشن کا انتظام کیا ہے میں بھی آؤں گی۔"

اس کے بعد علیا حضرت میرے سامنے خمیدہ ہوگئیں، میں بھی انکے سامنے خمیدہ ہوگئی، پھر وہ تشریف لے گئیں۔

ان کے جانے کے بعد میں اس انقلاب پر غور کرنے لگی، علیا حضرت جیسی ہستی، آج مجھ سے ملنے آئی تھی، گو اپنی برتری کی نمائش میں انہوں نے کوئی قصر اٹھا نہ رکھی تھی، پھر بھی ان کی آواز کی چھپی ہوئی لرزش اور ان کے طور طریقہ سے یہ بات صاف طور پر نمایاں تھی، کہ بہر حال میرے مقابلہ میں کسی نہ کسی حد تک احساسِ کمتری میں وہ مبتلا ہوگئیں۔

(۵۵)

جشنِ مسرّت

جشن کا وقت آٹھ بجے شب کا تھا۔ سات بجے کے قریب قرنا بجی اور چیف خواجہ سرا دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔ اس نے کہا۔

"شہنشاہ دوراں، سلطان زماں، حامیٔ دین مبین اور زمین پر سایہ خداوندی نزول اجلال فرماتے ہیں۔

یہ سن کر مجھ پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سلطان معظم میرے پاس تشریف لا رہے تھے۔

بہت جلد میں صورت حال کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئی، میں نے اپنے لباس پر نظر ڈالی وہ اتنا ہی شاندار تھا جتنا ہونا چاہیے، آئینہ میں میری نظر اپنی آنکھوں پر پڑی۔ ان کی سحر طرازی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اتنے میں شاہنشاہ دوراں اور سلطان زماں تشریف لائے ——— بادشاہ! میرا بادشاہ! میرے دل کا بادشاہ،

میں بے تابی کے ساتھ اٹھی اپنی طرف ان کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو میں نے آنکھوں سے لگایا۔ اور بوسہ دیا، میرا ہاتھ پکڑے پکڑے وہ دیوان میں تشریف لائے، یہاں انھوں

نے میرے لباس پر نظر ڈالی اور فرمایا۔

"ہمارے باغ کا سب سے خوبصورت پھول اس لباس میں کتنا سجتا ہے اور یہ جگمگاتے ہوئے جواہرات اس کے رخسار تاباں کے سامنے ماند نظر آتے ہیں۔"

گرم خون میرے رخساروں پر نمایاں ہوا۔ ان الفاظ نے مجھ پر جادو کر دیا۔ سلطان معظم نے مجھ سے فرمایا۔

"مابدولت کی مرضی ہے کہ محفل جشن میں تم ہمارے پاس دست راست کی طرف بیٹھو!"

میں نے عرض کیا میں اس عزت افزائی کا شکریہ میرے آقا کن الفاظ میں ادا کروں ترکی میری مادری زبان نہیں ہے، مجھے وہ الفاظ نہیں ملتے جو آپ کے تحفہ اور عطیہ پر میرے شکر و سپاس کی صحیح ترجمانی کر سکیں۔"

سلطان معظم نے ارشاد فرمایا۔

نشاط سلطانہ تمہارے یہ الفاظ میرے کانوں کے لئے موسیقی سے زیادہ دلکش ہیں۔ تمہاری باتیں اتنی ہی پیاری ہیں جتنا تمہارا چہرہ!"

یہ کہتے کہتے سلطان زماں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا میں لرزنے لگی۔ جیسے ایک گنہگار کسی ایسی ہستی کے سامنے لرزنے لگتا ہے جو دل کے بھید جانتی ہے: میرے بادشاہ نے میری ہتھیلی دیکھی اسے بوسہ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اب ہم جاتے ہیں ٹھیک نصف گھنٹہ کے بعد تم ہال میں آجاؤ! تمہاری تابانی سے میرے دل کا ایوان بھی روشن ہو جائے گا۔"

یہ آخری الفاظ انہوں نے آہستہ آہستہ بڑے محبت بھرے لہجہ میں کہے۔ سلطان تشریف لے گئے میں تنہا رہ گئی طرح طرح کے خیالات نے مجھے نرغہ میں لے لیا۔

سلطان میانہ قد کے آدمی تھے لیکن لباس شاہی میں دراز قامت اور بھاری

محبرکم نظر آتے گتے تھے۔ پگڑی میں ایک ہیرا جگمگا رہتا تھا۔

نصف گھنٹہ گذر گیا۔ میرا چیف خواجہ سرا آیا اور اس نے کہا۔

"تشریف لے چلئے ــــــــــــــ!"

میرے اٹھتے ہی دو مرتبہ قرنا بجی، یہ میری روانگی کی علامت تھی، چیف تا رن نے میرے کندھوں پر فر ڈال دی۔

جشن کا ہال نہایت وسیع اور کشادہ تھا، ہر طرح سے مرصع اور آراستہ۔ سوطاین والدۂ سلطان، سلطان کی خالہ اور بہنیں، بھانجیاں اور بھتیجیاں، ایک گول میز کے گرد بیٹھ گئیں،

تھوڑی دیر کے بعد سلطان زماں تشریف لائے اور میرے پہلو میں بیٹھ گئے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ہر نگاہ مجھ پر پڑ رہی ہے، لیکن میں نہایت اطمینان سے اپنے مقام پر متمکن تھی، میرا دل فخر سے لبریز تھا، میں اب باندی نہیں تھی۔ جس طرح حرم کی دوسری عورتیں تھیں، میں ایک بڑے قبیلے کے سردار کی بیٹی تھی۔ اور اپنے اس فخر کو میں نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ سلطان کی نگاہیں بھی مجھ پر پڑ رہی تھیں۔ یہ پسندیدگی کی نگاہیں تھیں۔ مجھے اپنے حسن کا احساس تھا، اتنا شدید احساس آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، میں اسے بھی محسوس کر رہی تھی کہ حرم سرا کی دوسری عورتیں مجھے نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں، کھانے کے دوران میں میرا انداز والدۂ سلطان سے بھی زیادہ شاندار رہا۔ وہ اپنے تمام وقار۔ وتمکنت کے باوجود اس طرح کھا رہی تھیں کہ ان کے چبانے اور کھانے کی آواز دوسروں تک پہنچ رہی تھی۔

جشن کے دوران میں ایک بلند چبوترے پر ناچنے والیوں کے طائفے ناچ رہے تھے یہ بڑی خوبصورت اور دلفریب لڑکیاں تھیں، لیکن سلطان میرے سوا کسی کی طرف متوجہ نہ تھے، وہ بار بار سر جھکا کر مجھ سے دریافت کرتے۔

"آیا یہ کھانا مجھے مرغوب ہے؟ ہال کی آراستگی مجھے پسند ہے؟ اور پھر گرشتی

کے لہجہ میں وہ میرے حسن و جمال کی تعریف کرنے لگتے۔

اس وقت سلطان کی دوسری محبوباؤں کا مجھے خیال نہیں تھا۔ وہ رخصت ہو گئیں اور فراموش کر دی گئیں، حرم سرا کے آسمان پر میں اس وقت چاند کی طرح چمک رہی تھی۔

سلطان کے اس التفات اور توجہ نے میرا دماغ عرش بریں پر پہنچا دیا تھا۔

سلطان نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں فرمایا:

"میں نے تمہارے لئے ایک نہایت خوبصورت اور شاندار حجرے کا انتظام کیا ہے جو صرف تمہاری سیر و تفریح کے لئے وقف ہوگا۔"

میں نہیں کہہ سکتی کہ سلطان کے ان الفاظ نے میرے اوپر کیا اثر کیا۔ مجھے ایوانِ شاہی کے آداب و تکلفات کا علم تھا۔ شاید اس سے پہلے کسی سے بھی سلطان نے اس طرح گفتگو نہیں کی تھی، اس عنایت اور مہربانی نے مجھے بے خود کر دیا تھا۔

میں نے جواب میں عرض کیا۔

"میرے بادشاہ! آپ کی اس مہربانی نے آپ کی اس باندی کا دماغ عرش پر پہنچا دیا ہے، خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔"

بادشاہ نے کہا۔

"اور تمہارے اس جان نواز تبسم کو بھی!"

آخر کار جشن ختم ہوا، باندیاں مہکتے ہوئے پھولوں کے گلدستے ہم سب کے لئے لائیں، سلطان نے ایک گلدستہ لے کر میری طرف بڑھایا۔ اس گلدستہ میں ایک سونے کی ڈبیا رکھی تھی، اسے کھولا تو ایک ہیرا چمک رہا تھا۔ انہوں نے ہیرے کے بٹن پر ہاتھ لگایا، ایک ڈبیا کی طرح وہ کھل گیا۔ اس میں سے ایک ننھی سی گھڑی نکلی جسے انہوں نے میرے کان پر لگا دیا اور فرمایا۔

"سنو! یہ چل رہی ہے، یہ دنیا میں سب سے زیادہ چھوٹی اور نایاب گھڑی ہے۔"

میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے وہ گھڑی لے لی۔

بادشاہ نے کہا۔

"تمہاری ان چمکدار اور روشن آنکھوں کے سامنے ہیرے ماند پڑے جاتے ہیں"

میں جواب نہیں دے سکی، جذبات سے اتنی مغلوب تھی کہ زبان جنبش تک نہ کر سکی۔ یہ الفاظ اس سلطان کے منہ سے نکل رہے تھے جس کی ایک جنبش لب آدمی کی زندگی اور موت، عروج اور زوال کا فیصلہ کر سکتی تھی، پھر یہ سن کر میری مسرت اور دوچند ہو گئی کہ یہ اہتمام جشن صرف میری خاطر ہوا تھا، سارا مجمع جو یہاں نظر آ رہا تھا رشک و حسد کی نگاہ سے مجھے دیکھ رہا تھا، صرف دو ہستیاں اس وسیع اور کشادہ ایوان میں ایسی تھیں جو حسد کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے محبت کرتی تھیں ——— میں اور سلطان!

ہم دونوں اس سارے مجمع میں سب سے زیادہ بلند و برتر تھے۔ اور ہماری یہی برتری دوسروں کی آنکھ میں خار کی طرح کھٹک رہی تھی، یہ وہ عورتیں تھیں جو میری جگہ لینے کی فکر میں تھیں، مجھے ان پر ترس بھی آ رہا تھا، میں سوچتی تھی اگر ان کی جگہ میں ہوتی تو شاید میرا بھی یہی عالم ہوتا۔

دعوت سے فارغ ہو کر ہم دوسرے ہال میں پہنچے، یہاں رقص و نغمہ کی محفل ترتیب دی گئی، یہاں بھی سلطان معظم رقص کی دلفریبی اور نغمہ کی سحر طرازی کی طرف اتنے متوجہ نہیں تھے جتنے میری طرف!

تھوڑی دیر کے بعد یہ محفل بھی ختم ہو گئی۔ سلطان میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اپنے کمرہ کی طرف آیا۔ اس کمرہ کی شان و شوکت کا حال بھی وہی تھا جو دوسروں کا تھا اب ہم دونوں تنہا تھے، میں جذبۂ محبت سے مجبور ہو کر آگے بڑھی اور بادشاہ کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگایا اور بوسہ دیا۔ اتنے بڑے عظیم المرتبت اور شاندار آدمی سے مجھ جیسی حقیر ہستی محبت کرنے کا حق نہیں رکھتی تھی لیکن کرتی تھی، اور خود سلطان بھی مجھ سے محبت کرتے تھے۔

---

(۵۶)

جب سورج گوشۂ مغرب میں جا چھپتا

سلطان کی منظورِ نظر بننے کے بعد سے، میری زندگی صرف عیش و عشرت اور نشاط و مسرت کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھی، تحائف کا انبار لگا رہتا تھا، میرے سامنے سارا دن درباری مصروفیتوں میں گزر جاتا، اُسے باریاب کرنا ہے، اسے شرفِ حضوری عطا کرنا ہے، اس کی فریاد سُننی ہے، اس کی التجا پر کان دھرنے ہیں اور جب سورج گوشۂ مغرب میں جا چھپتا، آسمان پر تارے جگمگانے لگتے اور چاند چمکنے لگتا، تو میری زندگی کا اور زیادہ مسرت بخش اور نشاط افزا دور شروع ہوتا، سلطانِ معظم، مجھے یاد فرماتے کبھی گوشۂ باغ میں، کبھی دیوانِ زمردیں میں، کبھی بارگاہِ فلک رفعت میں کبھی نیلے آسمان کے نیچے فرشِ چمن پر میں حاضر ہوتی، مجھے دیکھ کر وہ نہال ہو جاتے، انہیں پاکر، میں خوشی سے پھولی نہ سماتی، میں انہیں گیت سناتی اور وہ محو ہو کر سنتے، میں ان سے جارجیا کی باتیں کرتی، اور وہ پورے التفات کے ساتھ میری باتوں میں کھوتے جاتے ــــــ نصر بلید یزاب میرا تھا، جارجیا کی یادیں یہاں کی رنگینیوں میں گم ہوتی چلی جارہی تھی۔

کبھی ایسا ہوتا، شب ماہ میں ہم باغ کی گلگشت میں مصروف ہو جاتے۔ ایسے مواقع پر "خلوت" کا فرمان صادر ہو جاتا، پھر پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا تھا، سوا پہرہ داروں اور محافظوں کے کوئی جاندار مخلوق نظر نہ آتی اور ہم بنہایت اطمینان سے سکون و یکسوئی کے عالم میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سیر چمن میں مصروف ہو جاتے سبزہ ایسا معلوم ہوتا، جیسے کسی نے ہرے رنگ کا قالین فرشِ زمین پر بچھا دیا ہے، سنہرے سہرے والے سفید مینار درختوں کے جھنڈ سے اس طرح جھانکتے، جیسے کوئی سپاہی پگڑی باندھے پہرے پر کھڑا ہے۔

بڑی دیر تک ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دو معصوم بچوں کی طرح ہم باغ میں گلگشت کیا کرتے۔ ہر فکر سے آزاد، ہر اندیشہ سے بے پروا حرم سرا میں اب بھی ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت ہستی موجود تھی، لیکن میں اب کسی سے اپنے لئے خطرہ محسوس نہیں کرتی تھی، میرا خیال تھا، میرے دامن تک اب کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا، خواہ کوئی مجھ سے جلے یا بددعا دے اور کوسے۔

میری فرصت کا سارا وقت سلطان عالی شان کی خدمت میں بسر ہوتا تھا، کبھی وہ خود تشریف لے آتے کبھی مجھے یاد فرما لیتے، کپڑوں پر مجھے بہت دھیان دینا پڑتا تھا، کیونکہ ایک لباس میں دوسری مرتبہ مجھے دیکھنا کسی طرح سلطان کو گوارا نہیں تھا، کئی عورتیں صرف اس کام پر مامور تھیں کہ میرے لباس سے ملتے جلتے جواہرات کا انتخاب کر کے انہیں ٹانکیں اور لگائیں، اسی طرح میرے جوہری بھی بہت مصروف رہتے تھے، نگوں اور زیورات کی تراش خراش اور انہیں از سرِ نو درست کرانے کا کام برابر جاری رہتا۔

---

(۵۷)

میں اور میرا بادشاہ

دعوت کے کھانے پر میں تھی اور میرا بادشاہ! کوئی اور نہ تھا۔ ہم دونو بہت خوش تھے۔ تمام پریشانیاں اس وقت بھولی ہوئی تھیں۔

میرے پہلو میں وہ شخص بیٹھا تھا جو دنیا کا سب سے بڑا فرمانروا تھا۔ زمین پر خدا کا سایہ تھا۔ جن کی نگاہِ التفات بہتوں کے لئے پیامِ زندگی اور جس کی نگاہِ قہر بہتوں کے لئے پیامِ موت تھی۔ حکومتیں اس کے نام سے لرزتی تھیں۔ بڑے بڑے دبدبے اور تنتنے والے بادشاہ اس سے دوستی پر فخر کرتے تھے۔ بڑے بڑے ملکوں کے سفراء عجز اور خاکساری کا پیکر بن کر اس کے سامنے حاضر ہوتے تھے۔ اس کی قوت و طاقت اور حشمت و سطوت کا اندازہ کون کر سکتا تھا؟ لیکن اس وقت وہ اپنی قوت و طاقت دروازہ پر چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ یہاں وہ ایک انسان تھا، جس کا دل محبت کرتا ہے، جس کی آنکھیں حسن کی پرستش کرتی ہیں۔ ہم دونوں اس وقت بہت خوش تھے۔ ہم جنہیں ہر چیز حاصل تھی، کچھ دیر تک میں نے نئے سیکھے ہوئے ترکی گیت اپنے بادشاہ کو سنائے، پھر ہم باغ میں ٹہلنے لگے۔ یہ باغ میری حسرتوں اور آرزوؤں کا نشیمن تھا۔

لیکن میری یہ خوشی اور میرا یہ دماغی سکون زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ دوسرے دن صبح کو میری دو جاسوس باندیاں عجیب خبریں لے کر آئیں۔

ایک جاسوس باندی نے مجھے بتایا کہ حرم میں ایک نئی رقاصہ لڑکی داخل ہوئی ہے۔ اتنی خوبصورت کہ حور جنت بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ تقریب سالگرہ پر والدہ سلطان اسے سلطان معظم کی خدمت میں تحفہ کے طور پر پیش کریں گی۔

دوسری جاسوس باندی نے رپورٹ دی کہ اسے ایک دوسری باندی سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی مالکہ مجھے ہلاک کر دینے کی سکیم تیار کر رہی ہے۔ وہ ایسا زہر ہلاہل تیار کرا رہی ہے کہ اگر وہ بدن سے چھو جائے تو بھی آدمی فوراً ہلاک ہو جائے۔

یہ خبریں سن کر میرا سکون درہم برہم ہو گیا۔ میں نے والدہ سلطان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مجھے صلاح دی کہ اس بارے میں سلطان معظم سے کچھ نہ کہوں۔ وہ خود مختلف وجوہ سے کافی پریشان ہیں۔ مجھے ان کی پریشانی میں اضافہ نہ کرنا چاہئیے۔ پھر انہوں نے فرمایا۔

"میری بیٹی وہی ہوگا جو لکھا جا چکا ہے۔ میرا ارادہ میرا قانون ہے۔ میں جانتی ہوں حرم سرا کی عورتیں کتنی سازشی ہیں وہ ہمارے دشمنوں سے ملی ہوئی ہیں۔ میرا اور تمہارا وجود ان کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔"

میں نے پوچھا

"خواجہ سراؤں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ بھی ہمیں دھوکہ دے سکتے ہیں؟"

انہوں نے فرمایا

"بے شک! یہ بڑے خطرناک ہیں۔ یہ دغا کے پتلے کسی کے بھی دوست نہیں ہیں۔ اور مصیبت یہ ہے کہ سب سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ ہم بھی ان کے سامنے

بے بس ہیں۔"

پھر میں نے لولا کو بلایا، اور اس سے کہا۔

"بتاؤ ان خطرات سے میں کس طرح محفوظ رہ سکتی ہوں؟"

لولا پر وہی کیفیت بے خودی کی طاری ہوگئی، اس نے کہنا شروع کیا۔

"میں خون دیکھ رہی ہوں، نفرت، عداوت، دشمنی ہر طرف نظر آ رہی ہے۔ ایک اور عورت ہے جو تمہاری طاقت کو چیلنج کرنا چاہتی ہے۔ وہ اتنی حسین ہے جیسے نئی صبح! جیسے گل رعنا، اسے قتل کر دو صرف اسی طرح بچ سکتی ہو۔"

میں چیخ پڑی

"لولا! لولا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو، خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو، للہ میرا دماغی سکون درہم برہم نہ کرو۔ میں کسی کو قتل نہیں کر سکتی، میں ہرگز کسی کو قتل نہیں کروں گی۔ یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

پھر میں اٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ یہاں سے باغ کا دلکش منظر صاف نظر آ رہا تھا، زندگی کتنی حسین لیکن کتنی تاریک بھی، میں نے دیکھا لولا اٹھ کھڑی ہوئی، میں نے اس سے کہا۔

" ذرا سوچو تو سہی، میں ایک ایسی لڑکی کو کس طرح قتل کر دوں، نہ جسے میں نے دیکھا ہے نہ جس سے میں واقف ہوں۔"

میں لولا سے یہ باتیں کر رہی تھی اور میرے بدن پر رعشہ طاری تھا، میں سوچ رہی تھی، کیا یہ اقتدار میرے ہاتھ سے نکل جائے گا؟ کیا باندی بن کر پھر حرم سرا میں زندگی بسر کرنا پڑے گی؟ نہیں! اس سے تو موت بہتر ہے۔"

لولا نے مجھے پھر مخاطب کیا، اس نے کہا

"نشاط سلطانہ، میں اس لڑکی کو تمہارے راستے سے ہٹا سکتی ہوں، میرے

لئے وہ گناہ نہیں ہے جسے تم اپنے لئے گناہ سمجھتی ہو۔"

میں نے بے کلی کے ساتھ کہا۔

"کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔"

وہ کہنے لگی۔

"بہتر! لیکن یاد رکھو ——— کہ تم اپنی حریف سے بازی لے جاسکو گی! نہ زہر سے بچ سکو گی۔"

یہ سن کر میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ ان الفاظ نے مجھے دہشت زدہ کر دیا۔ میں نے کہا۔

"تو بتاؤ پھر میں کیا کروں؟" ———————

لولا نے نہایت پرسکون حالت میں جواب دیا۔

"بہت سے وسائل اور ذرائع ہیں نشاط سلطانہ! ان سے کام لو۔ تم "ہاں" کہو پھر دیکھو میں کیا کرتی ہوں۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"لولا چلی جاؤ! ——— جاؤ میں اس وقت بات نہیں کر سکتی' میرے سر میں درد ہو رہا ہے' میرا دل تڑپ رہا ہے' میری روح بے قرار ہو رہی ہے۔"

لولا نے کہا۔

"میری بچی میں جاتی ہوں، خدا تمھیں سکون عطا کرے' لیکن اگر سکون نہ ملے تو مجھے بلا لینا' میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔"

بعد کے چند روز ایسی پریشانی میں گزرے کہ میں اپنے دشمنوں کے بارے میں بھی کچھ نہ سوچ سکی۔ سلطان معظم بہت پریشان نظر آ رہے تھے' میری نغمہ طرازی تک انھیں خوش نہ کر سکی' میں اپنی پریشانیاں بھول گئی۔ اب مجھے ایک ہی فکر تھی۔ میرا آقا!

میرا بادشاہ، پریشانیوں سے نجات پا جائے، اسے خوش دیکھنا میرا سب سے بڑا انعام تھا، اس کا مجھ سے سرگوشی کرنا میری مسرّت کی انتہا تھی،

میرا بادشاہ جب چلا جاتا اور میں تنہا رہ جاتی تو طرح طرح کے توہمات اور تفکرات مجھے گھیر لیتے، مجھے رات رات بھر نیند نہ آتی، گھڑی گھڑی کی ٹمک ٹمک سنا کرتی، اسی سے رات کے گذرنے کا اندازہ ہوتا رہتا۔

مصیبت تو یہ تھی کہ میں والدہ سلطان تک پر بھروسہ نہیں کر سکتی تھی، وہ مجھے اپنے راستہ کا پتھر سمجھنے لگی تھی، ایک عورت ایسے موقعوں پہ اپنے شوہر کے دامن میں پناہ ڈھونڈتی ہے، اپنے محبت کرنے والے سے امداد طلب کرتی ہے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کر سکتی تھی، میں خاموش رہنے پر مجبور تھی۔

ہر روز نئی نئی کہانیاں سننے میں آتیں۔ جن سے میری پریشانیوں میں اور اضافہ ہو جاتا۔ ادھر سلطان کا یہ عالم تھا کہ وہ محل سے باہر نہ نکلتے، صرف جمعہ کے دن نماز پڑھنے چلے جاتے، حرم سرا میں یہ افواہ گرم تھی کہ انھیں اندیشہ ہے کہ کوئی انہیں قتل کر دے گا۔ ان کے کئی پیش رو قتل کئے جا چکے تھے، مشہور تھا کہ آجکل انہیں نیند بھی کم آتی ہے اس فکر نے دن کا چین اور رات کا خواب ان پر حرام کر رکھا تھا۔ میرا دل ان کی اس کیفیت سے کڑھتا رہتا تھا، اتنے بڑے شہنشاہ ہوتے ہوئے بھی اور اتنا بڑا خدم و حشم رکھتے ہوئے بھی تنہا تھے، کوئی ان کے برابر کا نہ تھا، وہ کسی کو اپنا ہمراز نہ بنا سکتے تھے، یہی کیفیت میری تھی، لیکن ایک فرق بھی تھا، میں اپنی باندیوں سے اور لولا سے باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

آخر خدا خدا کر کے سلطان معظم کی سالگرہ کا دن آیا، میرے لئے یہ دن خطرات سے گھرا ہوا تھا، ساری رات میں نہیں سوتی۔ یونہی کروٹیں بدلتی رہی۔

صبح صبح لولا میرے پاس آئی، اس نے مجھ سے کہا۔

"نئی باندی آج سلطان کے سامنے تقریب سالگرہ کے موقع پر اپنے رقص کا کمال دکھائے گی" نشاط سلطانہ! کان کھول کر سن لو! آج تم دونو کا مقابلہ ہے، جو بھی بازی لیجائے"۔

یہ سن کر میں ہکا بکا رہ گئی۔

گزشتہ ایک سال سے میں سلطان کی منظور نظر چلی آرہی تھی، اس ایک سال کی مدّت میں وہ کون سی بات تھی جو مجھے حاصل نہیں تھی، کیا وقت آگیا ہے کہ مجھ سے سب کچھ چھین لیا جائے، اتنے میں میں نے سنا، لولا کہہ رہی تھی۔

"ابھی وقت ہے! یاد رکھو جو پھول جتنا زیادہ تر و تازہ ہوگا، اتنا ہی پسند کیا جائیگا"

یہ سن کر میں بگڑ گئی، میں نے کہا

"لولا تم کیا کہتی ہو، کیا میں بوڑھی ہو گئی ہوں؟ بدصورت ہو گئی ہوں؟ کیا بات ہے آخر؟"

لولا مسکرائی اور کہنے لگی۔

"نہ تم بوڑھی ہو نہ بدصورت! نشاط سلطانہ! لیکن یہ حرم ایک بازار ہے جہاں صرف حسن کی پوچھ ہوتی ہے، آج جو لڑکی تمہارے مقابلہ میں آرہی ہے، اس کے بال سونے کی طرح ہیں۔ اس کی آنکھوں کی چمک تمہارے ہیروں سے زیادہ ہے، اس کا حسن سادہ نہ غازہ کا محتاج ہے نہ آرائش کا۔ اس کا حسُن قیامت کا ہے، وہ اگر کامیاب ہو گئی تو تم ناکام ہو جاؤ گی، تم رحم دل ہو وہ بے رحم ہے، تم معاف کر سکتی ہو وہ نہیں کر سکتی۔

پھر میرے دل میں خیال آیا، اگر یہ لڑکی مجھ سے بازی لے گئی تو میرا حشر کیا ہوگا! آج جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب کچھ اس کے پاس چلا جائے گا۔ اور میں خالی ہاتھ رہ جاؤنگی"۔

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا!——"

لولا نے کہا

" لولا تمہاری مدد کر سکتی ہے ! یہ پھول جو کھلنے والا ہے مرجھا سکتا ہے"۔

میں نے پوچھا

" مرجھا سکتا ہے ؟ ـــــــــــــ

وہ بولی

" کیوں نہیں ـــــــــــــ ! لولا ایسے تماشے بہت سے دیکھ چکی ہے ۔"

میں نے کہا ۔

" لیکن میں اس کی موت نہیں چاہتی، کوئی اور تدبیر سوچو"

وہ بولی

" تھوڑی دیر کے بعد میں پھر آؤں گی، جو آپ کہیں گی، میں کروں گی ۔"

یہ کہہ کر وہ خاموشی کے ساتھ چلی گئی ۔

میں پھر اکیلی رہ گئی، میں تھی اور میرے خیالات، بھیانک مستقبل میرے سامنے منہ کھولے کھڑا تھا اور کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا ۔

کیا تم ان سب چیزوں سے دستبردار ہو جاؤ گی ؟

یہ ملبوسات فاخرہ یہ بیش بہا جواہرات، یہ شاندار محل ؛ ان سب پر ایک مرتبہ نظر ڈالو اور سوچو کیا تم ان کی مستحق نہیں ہو ؟ کیا تم بھی اسی طرح خاموشی سے مرجاؤ گی، جیسے اور کئی عورتیں جان دے چکی ہیں ؟

میں یہی سوچ رہی تھی کہ میری جاسوس باندیوں نے مجھے آکر بتایا کہ آج حرم سرا میں صرف ایک ہستی کا ذکر ہر زبان پر ہے، اور وہ ہے زلیخا! نئی رقاصہ

یہ سن کر میرے آئے گئے حواس غائب ہو گئے، اتنے میں لولا آتی نظر آئی ۔

میں اب ایک فیصلہ پر پہنچ چکی تھی، میں نے اس سے کہا ۔

" جو چاہو کرو ۔ مجھے زلیخا سے نجات دو ! نہ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں، نہ اس کا

ذکر سنا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے پاگل کر دے گی، میں اپنے حق سے اس کے لئے دستبردار نہیں ہو سکتی، جاؤ، جو کچھ تمہیں کرنا ہو کر گزرو" ——————

لیکن بولا جا چکی تھی' شاید اس نے مجھے دیکھتے ہی یہ رائے قائم کر لی تھی کہ میں اپنا سابقہ فیصلہ بدل چکی ہوں۔

میرے دل سے آواز اٹھی

"تم یا وہ ——————

سارا دن ذہنی اذیت میں گذرا' پھانسی کے قیدی کو بھی کال کوٹھڑی میں وہ اذیت نہ ملتی ہو گی جو اس عرصہ میں میں نے بھگت لی' اتنے میں ایک باندی آئی اور اس نے کہا۔

"زلیخا نے پاگل ہو کر خودکشی کر لی ہے ——————"

میں نے اطمینان کا سانس لیا' زلیخا میرے رستہ سے ہٹ گئی تھی!

---

(۵۸)

رحم دِل تُرک

زلیخا کی موت نے میری ساری فکریں دور کر دیں، اب میں اپنے آقا کی بلا شرکت غیرے مالک تھی، نہ کوئی خطرہ تھا نہ اندیشہ،

ایک روز ایسا واقعہ پیش آیا، جو میرے اور ترک قوم کے اختلاف فکر و نظر کا آئینہ دار ہے،

وزیر اعظم کو رپورٹ کی گئی کہ کتوں کے آوارہ گرد گتے بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں اور ان میں ایک خطرناک بیماری پھیل گئی ہے، ضروری ہے کہ کوئی ایسا قدم اٹھایا جائے جس سے اس خطرہ کا سدباب ہو سکے۔

دربار ہال میں اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک میٹنگ ہوئی جس میں وزیر اعظم، پولیس کا افسر اعلیٰ، چیف خواجہ سرا اور متعدد محکموں کے سربراہ شریک ہوئے تاکہ اس مسئلہ پر کوئی فیصلہ کریں،

جانوروں سے ترک بہت محبت کرتے ہیں اور کسی حالت میں بھی اس کی جان لینا گوارا نہیں کرتے۔

اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے جو جلسہ منعقد ہوتا، وہ کئی گھنٹے تک جاری رہا۔ اور کوئی فیصلہ نہ کیا جا سکا، آخر وزیر اعظم نے فیصلہ کر دیا۔ انہوں نے حکم صادر کیا،

" تین سو کتے جو نہایت خطرناک بیماری میں مبتلا ہیں، کشتیوں میں سوار کر کے باسفورس کے ایک دور دراز جزیرہ میں بھیج دیئے جائیں۔ ان کے ساتھ دو دن کا کھانا بھی بھیجا جائے۔"

سہ پہر کو تین سو کتے جمع کئے گئے اور انہیں کشتیوں میں سوار کر دیا گیا! ان کتوں کے ساتھ ایک مولوی صاحب بھی بھیجے گئے کہ اپنے سامنے حفاظت اور احتیاط سے جزیرہ میں اتروا کر کھانا ان کے سامنے ڈال دیں۔

مولوی صاحب نے اس حکم کی تعمیل کی، کتوں کو وہاں اتروایا، ان کے لئے دعائے خیر کی اور انہیں قسمت کے حوالے کر کے چلے آئے۔

میرے خیال میں ان کتوں پر رحم اس طرح کیا جا سکتا تھا کہ انہیں فوراً ہلاک کر دیا جاتا۔

---

(۵۹)

بغاوت کی تیاریاں

ایک مرتبہ کئی روز تک میرے آقا نے مجھے یاد نہیں کیا، جب کسی کی آہٹ سنتی خیال ہوتا مجھے طلب کیا گیا ہے، لیکن میرا خیال غلط نکلتا، چار دن اسی طرح گذرے میں سوچتی آخر کیا خطا مجھ سے سرزد ہوئی ہے، جس کی سزا مجھے دی جارہی ہے، جسے میرے بغیر ایک لمحہ قرار نہیں تھا وہ اتنا غافل کیوں ہوگیا ہے، کیا پھر کوئی آفت آنی والی ہے، کیا پھر کوئی خطرہ میرے سر پر منڈلا رہا ہے —— —— کہیں ایسا تو نہیں کہ سلطان عالم پناہ کے مزاج ناساز ہیں،

میں نے اپنے چیف خواجہ سرا کو بلایا، اور اس سے پوچھا،

"کیا بادشاہ کی طبیعت خراب ہے؟"

اس نے جواب دیا۔

"نہیں —— ! اچھے خاصے ہیں لیکن مصروف ہیں"۔

میرے کان میں لولا کے الفاظ گونجنے لگے، جو ہمیشہ خطرہ کے وقت استعمال کیا کرتی تھی، میرے دل میں اندیشہ پیدا ہوا سلطان نے کسی اور کو منظورِ نظر تو

نہیں بنا لیا، یہ سوچ کر میں تڑپ اٹھی اور بے قراری کے ساتھ کمرہ میں ٹہلنے لگی، جیسے کوئی جانور پنجرہ میں بند کر دیا جائے اور سر ٹپکنے لگے،

تھوڑی دیر کے بعد میں نے لولا کو بلایا، وہ آئی اس نے کہا

"خدا آپ کو سلامت رکھے ـــــــ"

میں نے اس سے التجا کی۔

"لولا! مجھے موت کی دعا دو، میں زندہ رہنا نہیں چاہتی"

وہ کہنے لگی،

"موت ـــــــ؟ آپ جیسی نوجوان، خوبصورت اور سحر طراز عورت موت چاہتی ہے!"

میں نے لولا سے پوچھا،

"کیا واقعی میں خوبصورت ہوں ـــــــ؟"

وہ کہنے لگی،

"ہاں ـــــــ! جیسے چودھویں کا چاند! جیسے تازہ کھلا ہوا پھول!"

میں نے کہا،

"لولا! تم غلط کہتی ہو ـــــــ"

وہ بولی،

"لولا سب کچھ جانتی ہے ـــــــ وہ اسرار عالم سے واقف ہے، کیا اس نے کچھ دن پہلے ایک مصیبت سے آپ کو نجات نہیں دلائی تھی؟"

میں نے اعتراف کیا،

"ہاں لولا! مجھے یاد ہے"

وہ کہنے لگی،

وہ طاقت میرے پاس اب بھی ہے، میں اُسے ہر وقت استعمال کر سکتی ہوں ـــــــ "

میں گھبرا گئی، میں نے پوچھا،

"تمہارا کیا مطلب ہے لولا ـــــــ ؟"

اس نے بے پروائی سے جواب دیا،

"وہی جو آپ نے پوچھا ـــــــ !"

میں نے سرگوشی کے لہجہ میں اس سے کہا،

"کیا تم میری پریشانی کا اندازہ نہیں کر ـــــــ ؟

بتاؤ وہ کون عورت ہے جو میری جگہ حاصل کرنا چاہتی ہے!"

لولا نے بتایا،

"بادشاہ سلامت کا وہی پرانا خبط ـــــــ !"

میں اور زیادہ پریشان ہو گئی، میں نے پوچھا،

"خبط کیسا ـــــــ ؟"

لولا نے کہا،

"ایک لڑکی ہے ـــــــ نادرہ! اس کی آنکھوں میں جادو ہے۔ وہ اس طرح چلتی ہے جیسے ہرن! یہ چشمِ فسوں ساز اور یہ دلربا رفتار اس کے ہتھیار ہیں، وہ اسی حرم سرا کی ایک باندی ہے! اس حرم سرا کو تم سمجھتی کیا ہو؟ یہ میدانِ جنگ ہے، خدا نے تمہیں بھی وہی ہتیار دیئے جو نادرہ کے پاس ہیں، اور ایک راز کی بات بتاؤں؟ ـــــــ ہتیار بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتے، اصل چیز ان کا طریقِ استعمال ہے ـــــــ "

میں نے لولا سے کہا۔

"صاف صاف کہو ————— !"

میری حالت اس وقت ایسی تھی، جیسے کسی بچے سے کوئی دوسرا بچہ اس کا مرغوب اور پسندیدہ کھلونا چھین لے،

لولا نے بڑے پُرسکون انداز میں کہا،

"سلطان معظم کے لیئے یہ پریشانی کے دن ہیں، کچھ ایسے عناصر اُبھر رہے ہیں جو عنانِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں، جو اس ملک کے مالک بن جانا چاہتے ہیں، جو سلطان کو جلاوطن کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں ————— یہ قاتل بھی ہیں!"

لولا کی یہ باتیں سُنکر میں اور زیادہ گھبرا گئی، میں نے کہا۔

"تم کیا کہہ رہی ہو ————— ؟"

لولا نے کہا۔

میں جھوٹ نہیں کہتی، میں جانتی ہوں، آغا پاشا کا دشمن ہے، اپنے آقا کی کا خون پی لینا چاہتا ہے، پھر ان سب پر مستزاد، نادرہ جو بادشاہ کو بالکل اپنے قبضہ میں لے لینا چاہتی ہے۔"

میں نے بے بسی سے پوچھا،

"لولا بتاؤ میں کیا کروں ————— "

وہ کہنے لگی،

"سب کچھ ہو سکتا ہے ————— !"

"کیا تمہارا مطلب ہے کہ ————— ؟"

لولا نے آنکھ بند کر لی، اور گویا ہوئی،

"میرا مطلب یہ ہے کہ جو چڑیا سلطان معظم کی چمنستانِ آرزو کے سب سے

خوبصورت پھول یہ چیخ مار رہی ہے، اسے باغ سے نکال دیا جائے،
باہر پھینک دیا جائے"
لولا کا مطلب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا،
میں نے پوچھا۔
"مگر کس طرح یہ بھی تو بتاؤ ——— ؟"
لولا نے بتایا
"اس طرح کہ وہ پرواز کی قوت سے محروم ہو جائے!"
"میں سہم گئی" میں نے کہا۔
"ان باتوں سے تو میرا دل اور الجھ تا ہے ——— ؟
لولا ہنسنے لگی، اس نے کہا۔!
"بس تو پھر اپنے زوال کے لئے تیار ہو جاؤ ——— !"
لولا کے ان مختصر سے الفاظ نے میرے سامنے دو راستے کھول دیئے، یا تو
میں اپنے آقا کو ناورہ کے پنجہ سے بچاؤں، ورنہ خود اس کے پنجۂ ستم میں اسیر
ہو جاؤں ۔
مجھے متفکر دیکھ کر لولا نے کہا!
"میں بتا چکی ہوں کہ یہ حسرم سرا میدانِ کارزار ہے اتم تو غم میں گھر ی گئی
ہو، تمہیں اختیار ہے کہ میرا بتایا ہوا طریقہ اختیار کرو، یا قید ہونے، ختم ہونے، اور
ذلیل و رسوا ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ———"
یہ الفاظ میں نہ سن سکی، میں نے کہا۔
"لولا! خدا کے لئے چپ ہو جاؤ ——— "
وہ مسکرائی اور بولی،

میں تو صرف صاف اور سیدھی بات کہہ رہی ہوں، جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

میں نے ہتھیار ڈال دیئے، میں نے کہا!

"جو کچھ مجھے حاصل ہے، میں اسے نہیں چھوڑ سکتی، وہ میری زندگی ہے، میری روح ہے ——— !"

لولا نے میری اس کیفیت سے متاثر ہوتے ہوئے کہا،

"میں جانتی ہوں! مجھے معلوم ہے ——— !"

لولا خاموش بیٹھی تھی، میں بھی خاموش بیٹھی تھی ———

لیکن اب میری بیقراری کم ہو رہی تھی، ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے میں نے کوئی سکون آور دوا کھالی ہے، اتنے میں میں نے سنا لولا کہہ رہی تھی!

"بہت مختصر مدت کے لئے تمہاری یہ پریشانی قائم رہے گی، پھر وہ چڑیا اڑ جائے گی اور تم اپنی جگہ پر آجاؤ گی!"

لولا چلی گئی،

لولا کے جانے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا، کچھ عجیب قسم کا سکون محسوس ہو رہا تھا، مجھے یونانی اور فرانسیسی زبان کا سبق یاد کرنے لگی، اتنے میں ایک باندی دوڑی دوڑی آئی اور اس نے کہا۔

"ظل اللہ تشریف لاتے ہیں!"

یہ سن کر میں بے تابی سے اٹھ کھڑی ہوئی، میری یونانی زبان کی کتاب فرش پر گر پڑی میری نگاہیں پردہ پر جا کر جم گئیں جہاں سے میرا بادشاہ نمودار ہونے والا تھا،

سلطان معظم خاموشی کے ساتھ تشریف لائے، میں نے ان کے دامن کو بوسہ دیا

اور جذبات سے بے قابو ہو کر صرف اتنا کہہ سکی،

"میرے آقا ———— !"

سلطان معظم نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور مجھے میرے پُرانے ناموں سے یاد کیا، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے ہیں، اُنہوں نے فرمایا،

"میں بہت مصروف تھا لیکن تمہاری یاد مصروفیت پر غالب آ گئی، اپنے آپ کو نہ روک سکا، چلا آیا!"

بادشاہ کے منہ سے یہ الفاظ سُن کر مجھ پر سرخوشی کی کیفیت طاری ہو گئی، میں نے عرض کیا،

"میرے آقا! یہ دن اس طرح گذرے ہیں ———— جیسے نزع کا عالم ————"

بادشاہ نے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا،

"نشاط! اپنے ملک کا کوئی اچھا سا محبت بھرا گانا سناؤ ———— کیونکہ جارجیا کے لوگوں میں شاعری رچی ہوتی ہے اور تم بھی ایک شاعرہ سے کم نہیں ہو۔"

میں نے ستار اُٹھایا اور گانے لگی بادشاہ کی آنکھیں چمکنے لگیں، ان کے چہرہ پر خوشی دوڑ گئی، انہوں نے فرمایا،

"یہ کوئی نیا گانا ہے نشاط! ————"

میں نے عرض کیا۔

"جی ہاں! آپ سرکاری کاموں میں مصروف تھے میں آپ کے لئے نئے نئے گانے تیار کر رہی تھی۔"

بادشاہ نے فرمایا

"نشاط! بڑی پیاری چیز ہو تم! خوشی کا راز خوب جانتی ہو!"

میں نے عرض کیا،

"اگر میرا کوئی راز ہے تو صرف میرا آقا! اس نے مجھے سب کچھ دیا، میں اس کے لئے کیا نہیں کرسکتی!"

بادشاہ نے میری طرف دیکھا۔ ان نگاہوں میں محبت جھلک رہی تھی، انہوں نے فرمایا:-

"آج میں تمہارا ایک نیا نام رکھتا ہوں ——— مرغ نغز طراز چلو کھانا کھائیں، پھر گانا سنانا، تمہارے پاس جو وقت صرف ہوتا ہے، بس وہی خوشی کا وقت ہوتا ہے"

یہ الفاظ سنکر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، جوش محبت سے، دفور تاثر سے! لیکن سلطان کے سامنے رونا آداب کے خلاف تھا، میں نے وہ آنسو پی لئے۔ لیکن میرے دل کی خوشی حد بیان سے باہر تھی،

دوسرے دن صبح لولا آئی، اس نے آتے ہی کہا،

"میں نے وہ چڑیا اڑا دی! ——— بس اس کے آگے کچھ نہ پوچھنا!"

اگرچہ میری گم شدہ مسرت پھر مجھے مل گئی تھی لیکن میرے خلاف سازشوں اور اسکیموں کا سلسلہ جاری تھا، حرم سرا کی ساری عورتیں ایک طرف تھیں، میں ایک طرف تھی، میری جاسوس باندیوں نے اطلاع دی کہ ایک سلطانہ نے مٹی کا ایک پتلا بنایا ہے جو میری صورت کا ہے اور اس کے سارے بدن میں پنیں چبھو دی ہیں ایک دوسری محترمہ نے الّو کی زبان اپنی گردن میں لٹکا لی ہے، ان کا خیال ہے

جب یہ سوکھ جائیں گی، تو میں ختم ہو جاؤں گی، ایک اور صاحب نے ایک مزار پر چلّہ کھنچوایا ہے، تاکہ صاحبِ مزار خدا سے کہہ کر مجھے غارت کرا دے۔

ایک اور خاتون نے ایک ہزار ہیروں کی اس شخص کو پیش کش کی جو میرے سر کے تین بال لا کر اسے دے دے تاکہ ان پر عمل پڑھا جائے اور میرا زوال ہو جائے۔

اس طرح کی رپورٹیں سننے میں ملتی رہتی تھی، ان سازشوں اور سکیموں کے معنی یہ تھے کہ میں سب سے بالا ہوں، یہ حاسد عورتیں جن کے جذبات میں اچھی طرح سمجھتی تھی، مجھ سے نفرت کرتی تھیں، مجھے اپنے راستہ سے ہٹا دینا چاہتی تھیں،

اکثر ایسا ہوتا کہ میں کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر قسطنطنیہ کے حسین دلنشیں نظارہ میں محو ہو جاتی اور پھر اپنے دل سے پوچھتی،

"کیا یہ میرا نہیں ہے، کیا میں اسے چھوڑ سکتی ہوں؟"

ہزاروں مجیدی اور اشرفیاں میں خیرات کیا کرتی تھی، تاکہ میرا ضمیر مطمئن رہے اس رات کا واقعہ ہے کہ میں بادشاہ کے قدموں میں بیٹھی تھی، ہم دونوں بے انتہا خوش تھے، دفعتاً انہوں نے فرمایا،

"کافر عورتوں یعنی فرانسیسی، انگریز اور یورپین عورتوں کے لباس مجھے سخت ناپسند ہیں، تم اسے کبھی پہننے کی کوشش نہ کرنا،"

میں نے جواب دیا۔

"ایسا کبھی نہ ہو گا ——————!"

سلطان نے فرمایا۔

"ہماری عورتیں یہ لباس پہن کر کچھ عجیب سی بن جاتی ہیں، خود ان کا لباس اتنا شاندار ہے اگرچہ میں نے یورپ کی سیر کی ہے، لیکن وہاں کا لباس میں بالکل پسند نہیں کرتا، بھلا لباس بدلنے سے کہیں عورت خود بھی بدل

سکتی ہے ؛ آخر یہ چاہتی کیا ہیں ؛ ان کے پاس کیا نہیں ہے ؛"

اتنے میں سلطان کا داستان گو حنیف آیا اور اس نے ایسی کہانی سنائی کہ ہم ہنستے ہنستے لوٹ گئے ——————

(۶۰)

آنسو!

اکثر شام کے وقت اپنے آقا کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے میں باغ کی سیر کیا کرتی۔ میں نے محسوس کیا اس زمانہ میں اپنی سلامتی کی طرف سے وہ بہت فکرمند ہیں اور میری سلامتی کے بارے میں بھی ——— وہ مجھ سے اکثر اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے، انہوں نے مجھے تاکید کر رکھی تھی کہ اپنے محل سے باہر نہ نکلوں، کسی کو اپنے پاس نہ بلاؤں اپنے خاص باورچیوں کے سوا کسی اور کا پکا ہوا کھانا نہ کھاؤں، یورپین خواتین کا بھیجا ہوا کوئی تحفہ قبول نہ کروں ——— ——— ان ہدایات کی تعمیل میں دل و جان سے کرتی تھی،

میرے جاسوسوں نے مجھے اطلاع پہنچائی کہ قسطنطنیہ میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے، سلطان کا ایک بھتیجا ان کے مقابلہ میں اُٹھ رہا ہے، اس نے بہت سے حامی جمع کر لئے ہیں اور ہر وقت اس کا اندیشہ ہے کہ فاتحانہ یلغار کرتا ہوا وہ شہر میں داخل ہو جائے گا، بادشاہ کے بڑے بڑے منصب دار اندر ہی اندر باغیوں سے ملے ہوئے تھے، ان لوگوں کا پروگرام یہ تھا کہ سلطان کو قتل کر دیں، اور ان کے بھتیجے کو

تخت پر بٹھادیں،

میں نے دیکھا کہ اب سلطان کے پاس ہر وقت دو ریوالور رہتے تھے۔ اس سے پہلے اتنا محتاط میں نے انہیں کبھی نہیں پایا تھا، جب وہ بیٹھتے تو دو ریوالور اپنے سامنے رکھ لیتے، ان کے دستے موتی کے تھے۔ یہ ہر وقت بھرے رہتے تھے، شروع شروع میں تو میں ان سے وحشت کھاتی، پھر عادی ہو گئی،

سب سے افسوس اور عبرت کا مقام یہ تھا کہ ہمشیرہ مدیحہ سلطانہ بھی اُن کے خلاف تھیں، اور دشمنوں کے ساتھ شریک! انہوں نے سلطان کی معزولی کی حمایت میں پروپیگنڈا شروع کر دیا اور "نوجوان ترک پارٹی" سے مل گئیں، محمد رشاد کا نام بار بار زبانوں پر آ رہا تھا، کیونکہ تخت کے اُمیدوار یہی تھے۔

میں تو اپنے سلطان کی عزیمت اور استقلال پر دنگ تھی، کس سکون کے ساتھ وہ ان شورشوں کا مقابلہ کر رہے تھے، مجھ سے اب وہ بہت بے تکلفی سے ملنے لگے، کھانے کے بعد بھی وہ میرا گانا ضرور سنتے، پھر بڑی دیر بیٹھے میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتے، وہ اس دنیا میں بالکل تنہا تھے، کوئی ان کا ہمدرد نہیں تھا۔

افواہیں روز بروز شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں، اسی تناسب سے سلطان معظم کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، ان کا سارا دن سرکاری و درباری مصروفیتوں میں گذرتا تھا، جس کسی کے بارے میں بھی، بغاوت یا سرکشی کی اطلاع ملتی بلا تامل اس کی گردن اڑا دی جاتی،

بے پناہ مصروفیتوں اور پریشانیوں سے پیچھا چھڑا کر وہ تھکے ماندے میرے پاس آ کر بیٹھ جاتے ان کی پریشانی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اپنے چھوٹے لڑکے عبدالرحمٰن سے بے انتہا مانوس ہونے کے باوجود اس سے بھی نہ کھیلتے تھے۔

آج کل "آزادی کی فوج" کا بڑا چرچا تھا، قوت و طاقت اس کے جلو میں

چل رہی تھی، سلطان معظم اس غرّاتے ہوئے شیر کو قابو میں لانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

دن میں کئی کئی بار دربار ہال میں شاہی کونسل کا جلسہ ہوتا، میں سلطان کا انتظار کرتی رہ جاتی، مگر وہ ایسے مصروف تھے کہ کسی طرح بھی نہ آپاتے۔ پوشیدہ راستوں سے جاسوس سلطان معظم کے پاس پہنچتے اور انہیں پیش آنے والے دہشتناک واقعات کی اطلاعات دیتے، ہم عورتیں، حرم سرا کی تتلیاں بدبختی کے اس طوفان کو کسی طرح بھی روکنے پر قادر نہ تھیں،

ایک رات سلطان پریشانی اور عجلت کے عالم میں میرے پاس تشریف لائے، وہ بے انتہا خستہ اور درماندہ نظر آرہے تھے، ان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، جیب سے دونوں ریوالور نکال کر جب انہوں نے میز پر رکھے تو ان کے مضبوط اور توانا ہاتھ لرز گئے۔

منہ سے ایک لفظ کہے بغیر وہ چپ چاپ میرے پاس آکر بیٹھ گئے، میں اُن کی یہ حالت نہ دیکھ سکی، میں نے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور کہا۔

"میرے آقا! کیا میں گاؤں ؟"

"نہیں نشاط! کسی اور وقت !"

تھوڑی دیر کے بعد میرے سر پر انہوں نے ہاتھ پھیرا اور چلے گئے۔

اُن کے تشریف لے جانے کے بعد میں رونے لگی، کاش! میں اپنے آقا کے کام آسکتی! یہ جواہرات، یہ اشرفیاں، یہ دولت اعلیٰ حضرت کو اس پریشانی سے نجات دینے میں ذرا بھی معین و مددگار ہوتیں، میں بالکل بے بس تھی کیونکہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ میرے احاطۂ اختیار سے باہر تھا،

ہاں ایک بات میں کر سکتی تھی ______ بڑی خوشی سے اگر میری

یہ حقیر زندگی ان کے کام آسکتی تو مجھے ذرا بھی نذر کر دینے میں تامل نہ ہوتا، میرے لئے اس سے بڑھ کر فخر کی بات کوئی نہ تھی کہ اپنی زندگی آقا کے قدموں پر نثار کر دوں۔

ایک روز صبح صبح سورج نکلنے سے بہت پہلے شور اور غوغا بلند ہوا اور پھر یہ بڑھتا ہی گیا، قدموں کے آگے اور پیچھے ہٹنے کی آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں میری ایک باندی نے آکر مجھے یہ اطلاع دی،

"محل کا محاصرہ کر لیا گیا۔"

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا،

"لیکن سلطان ؛ وہ کہاں ہیں؟"

باندی نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا،

"ہز امپیریل مجیسٹی اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھے ہیں، ان کے پاس کوئی نہیں جا سکتا"

اتنے میں مجھے معلوم ہوا کہ سلطان معظم نے اپنے ایڈی ڈی کمیپ کو صلح کا سفید جھنڈا لہرانے کا حکم دیا، جو اس بات کی علامت تھی کہ جنگ ختم ہو گئی، سلطان نے ہتھیار ڈال دیئے، بہت سے ملازمان شاہی جنہیں سزائے موت کا اندیشہ تھا، راتوں رات نکل بھاگے، بہت سے حرم سرا کی عورتوں کے پاس آکر چھپ رہے، میں نے اپنے خواجہ سرا سے کہا۔

"جاؤ سلطان سے کہو، میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔"

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا، اس نے کہا کہ سلطان کو اپنے کمرہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں، ہمیں رخت سفر باندھ کر تیار ہو جانا چاہیئے

یہ الفاظ سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے سزائے موت میرے خلاف صادر کر دی گئی ہے، اب یہاں سے ہمیں جانا پڑے گا۔ کہاں ہ————

یہ خدا کو معلوم ہے۔ سب سے پہلے میرا خیال جواہرات کی طرف گیا، انہیں اپنے قبضہ میں لینا چاہیئے۔ میں نے ایسا ہی کیا،

باندیوں سے مجھے معلوم ہوا، حرم سراؤں کی بہت سی عورتیں دشمن سے مل گئی ہیں، مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ کئی خواجہ سرا اذیت دے دے کر مار ڈالا گیا، گویا مرنے سے پہلے انہوں نے اپنے کرتوت کا پھل پا لیا،

دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ سلطان کا محبوب ترین خواجہ سرا ندیم بھی اپنے آقا کے خلاف سازش میں شریک تھا اور بہت سی اشرفیاں اور جواہرات لے کر وہ بھی بھاگ گیا۔

وزیر اعظم اور دوسرے حکام نے حرم سرا کی عورتوں سے ان کے گھروں کے پتے دریافت کئے، فوراً ہی ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو تار بھیجے گئے کہ اگر چاہیں تو اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو آکر لیجائیں، کئی ایسی تھیں جن کے عزیز اور رشتہ دار آئے اور ان کو ساتھ لے گئے بہت سی ایسی عورتیں تھیں، جو دوسرے روسا کے حرم سراؤں میں داخل ہو گئیں،

میں سلطان معظم کے احکام کا انتظار کرنے لگی، میرا خیال تھا وہ مجھے بلائیں گے، میرا فیصلہ تھا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں گی، خواہ وہ کہیں بھی جائیں، وہ اب سلطان ہیں یا نہیں، میرے آقا بدستور ہیں، میں ان کا دامن نہیں چھوڑ سکتی۔

میرے خواجہ سرا نے مجھ سے کہا۔

"خاقان ابن خاقان، سلطان ابن سلطان اب فرمانروا نہیں رہے"

میں نے اس سے کہا۔

"مجھے ان کے پاس لے چل"۔

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا

"کس کے پاس لے چلوں؟ وہ تو گئے"

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

گئے؟ کیا مر گئے؟ کیا مار ڈالے گئے؟"

"نہیں! نشاط سلطان نہیں مرے نہیں، وہ رخصت ہو گئے۔"

میں نے پوچھا

"کب؟ کہاں؟"

اس نے بتایا۔

"کل رات، جب خلقت سو رہی تھی، وہ ایک گاڑی میں بیٹھ کر۔ وفادار خادم رو رو کر انہیں الوداع کہہ رہے تھے، وہ بہت دور گئے، اب ہم انہیں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہ ایک ظالم اور سفاک شخص تھا اور اسی سلوک کا مستحق تھا۔"

یہ باتیں سننے کی مجھ میں تاب کہاں؟ چکر کھا کر میں فرش پر گر پڑی، خواجہ سرا نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"نشاط سلطانہ!"

میری آنکھوں نے پوچھا کہ تو کیا کہتا ہے میری زبان سے کوئی لفظ نہ نکل سکا، وہ کہنے لگا،

"سلطان کے ساتھ ان کی منظور نظر سفید بلی بھی ہے، شاید اس کی وجہ سے آپ کے لئے جگہ نہ نکل سکی!"

وہ چلا گیا، میں سوچنے لگی اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

کیا میرے لئے مناسب نہیں کہ میں سلطان کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار کروں؟

کیا وہ مجھے بالکل فراموش کر دیں گے؟"

کاش! میں انہیں الوداع کہہ سکتی!

کاش! رخصت ہوتے وقت میں ایک نظر انہیں دیکھ سکتی، قصر سلطانی پر اب ان لوگوں کا قبضہ تھا جنہوں نے سلطان معظم کو جلاوطن کر دیا تھا، اور اب میرا یہاں رہنا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔

ولا مجھے لے کر ایک پاشا کی بیوی کے پاس لے گئی، جسے وہ اچھی طرح جانتی تھی، یہاں آکر میں بیمار پڑ گئی، کافی دنوں کے بعد طبیعت ٹھیک ہوئی، ہر روز میں اپنے آقا کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار کرتی تھی، لیکن ہر روز مجھے مایوس ہونا پڑتا تھا۔

شاید میرے آقا نے مجھے فراموش کر دیا تھا، ایک باندی کو وہ کیوں یاد رکھتے؛ لیکن میں انہیں فراموش نہ کر سکی، وہ میرے دل کے، میری روح کے مالک تھے، میری یہ زندگی صرف انہی کے لطف و عنایت کی رہینِ منت تھی، انہوں نے مجھے دولت دی، خوشی دی، نئی زندگی عطا کی، وہ مجھے گلاب کے پھول سے تشبیہ دیا کرتے تھے، میرا چہرہ انہیں ماہِ تاباں کی طرح چمکتا نظر آتا تھا، میں انہیں نہیں بھول سکتی، لیکن وہ مجھے یاد رکھیں گے مجھے بلائیں گے، اس امید کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا تھا، عورت ایک چھٹا حاسہ بھی رکھتی ہے، اور اسی نے مجھے بتایا ہے کہ اب وہ مجھے کبھی یاد نہیں کریں گے۔

ابھی چند مہینے پہلے تک میں سلطان کی منظورِ نظر تھی، اب میں تنہا ہوں ایک بھولی بسری یاد! ماضی کی یاد مجھے پریشان کر دیتی تھی، مجھے جار جیا یاد آرہا تھا، میرا خیال تھا، میرا گم شدہ سکون اب مجھے وہیں مل سکے گا۔

میں نے اپنے بہت سے جواہرات فروخت کر دیئے، میرے پاس

اتنی رقم فراہم ہو گئی، جس سے باقی ماندہ زندگی آرام سے گزر جاتی ۔

دو غلاموں اور دو باندیوں کو لے کر میں چل کھڑی ہوئی، میں ابھی تک جوان تھی، اور جب جارجیا کی سرحد میں پہنچی تو ایسا محسوس ہوا جیسے میرا زخم دل مندمل ہونے لگا۔

آخر وہ دن آیا کہ میں اس گھر کے سامنے کھڑی تھی، جہاں میں نے جنم لیا تھا لیکن یہ گھر کہاں تھا؟ یہ تو ایک کھنڈر تھا، موت کا سناٹا ہر طرف چھایا ہوا تھا، یہاں مجھے سکھ ملا، خوشی ملی، آج یہاں غم بٹ رہا تھا اور صرف میرے حصّہ میں آرہا تھا، میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے اور چھلک چھلک کر رخسار پر گر رہے تھے۔ میں نے ان ٹھنڈی اور بے جان دیواروں کو پکڑنا چاہا، لیکن نہ پکڑ سکی آگے بڑھ گئی۔

مجھے میری بہن یاد آگئی،

میں اس کے گھر پہنچی،

میں نے سوچا کہ اپنا نام نہ بتاؤں، ملازم کو میں نے بہن کا نام لے کر پوچھا وہ کہاں ہیں، وہ مجھے گھورنے لگا، اس نے مجھے کہا۔

"دو برس ہوئے ان کا انتقال ہو گیا، اور ان کے شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے۔

میں نے پوچھا کیا تمہاری مرحومہ مالکہ سے کوئی اولاد بھی تھی؟

اس نے جواب دیا۔

"نہیں؟

اب میں بالکل تنہا تھی، میری بہن مر گئی تھی، میرا گھر کھنڈر ہو گیا تھا، میری قوم کے لوگ مجھے بھول چکے تھے، میرے دل نے چیخ چیخ کر ان سے کہا۔ "تم میرے اپنے

وگ ہو، میں ہمیشہ تمہیں یاد کیا کی، قصر یلدیز میں بھی میں نے فراموش نہ کیا۔
انہوں نے مجھے جواب دیا، الفاظ سے نہیں، نگاہِ خاموش سے!"

"اب تم ہمارے سردار کی بیٹی نہیں ہو، حرم سرا میں جا کر تم ہماری نہیں رہی، یہاں تمہاری کوئی جگہ نہیں! یہ تمہارا ملک تھا لیکن اب نہیں، یہاں سے تم کچھ نہیں پا سکتیں، اگر تم یہاں رہیں تو ماضی کو فراموش نہیں کر سکو گی، ایسا ماضی جس میں یہاں کا کوئی آدمی تمہارا شریک نہ ہو گا، وہ ماضی جس کے گھروندے میں اپنی آئندہ زندگی تم بسر کرنے پر مجبور رہو۔"

میں پھر قسطنطنیہ واپس چلی آئی نشاط سلطانہ کی حیثیت سے نہیں ایک ایسی ہستی کی حیثیت سے جو خود اپنی عظمت ماضی کے سایہ سے جدا نہیں ہو سکتی تھی، قسطنطنیہ نے مجھے بلایا میں آ گئی، قصر یلدیز کے سامنے ایک چھوٹا سا مکان میرا مسکن ہے، جہاں میرا مشغلہ خیرات کرنا، بھولنا، یاد کرنا، اور انتظار کرنا ہے ——— انتظار شاید میرا آقا مجھے اپنے پاس بلا لے، موسم بدلتا رہتا ہے، کبھی یاسمین کی خوشبو مشام جان کو معطر کر دیتی ہے کبھی باسفورس کی لہریں طوفان بدوش ہو جاتی ہیں ———

دن اسی طرح گذرتے رہے، موسم اسی طرح آتے اور جاتے رہے، زمانہ اسی طرح پلٹے کھاتا رہا، لیکن میرے پاس کوئی پیام نہ آیا،

اب میں بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو چکی ہوں، ہر طرف نیا ترکی مجھے نظر آ رہا ہے ——— نیا بدلا ہوا، یہاں کی عورتیں نقاب اتار چکی ہیں، آزادانہ سڑکوں پر گھومتی رہتی ہیں، میں ان کی پیروی نہیں کر سکتی، میرے لئے یہ اجنبی عورتیں ہیں، نصف مرد، نصف عورت! یہ اس عظمتِ ماضی سے ناواقف ہیں جو میرا حصہ تھا، نشاط سلطانہ ظل اللہ

کی منظور نظر۔ اب اس دنیا سے اکتا گئی ہوں ، اے رحیم و کریم خدا!
تجھ سے رحم کی التجا ہے ——————— مجھ پر رحم اور
کرم کر ——— !